بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انکارِ حدیث

ایک فتنہ! ایک سازش !!

پروفیسر محمد فرمان ایم۔ اے
(مصنف حیاتِ مجدد)

مکتبہ مجددیہ نور پور شرقی گجرات

انکارِ حدیث

ایک فتنہ !
ایک سازش !!

مصنفہ

پروفیسر محمد فرمان ایم۔ اے

(مصنف جانِ مجدد)

مکتبہ مجددیہ، نورپور شرقی گجرات

تعداد .... ایک ہزار
قیمت فی جلد .... دو روپے
محمد انور ...... مہتاب رقم
۱۹۶۴ء ۱۳۸۳ھ

ملنے کا پتہ

مکتبہ مجددیہ، نور پور شرقی، گجرات (پاکستان)

محمد خورشید خاں بی۔ اے
منیجر مکتبہ نے پنجاب الیکٹرک پریس گجرات سے چھپوا کر مکتبہ مجددیہ نور پور شرقی
گجرات سے شائع کیا

فہرست

اللہ مفتح الابواب

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

حضرت نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت کاملہ کے محاسن سے بحث کرنا اس تصنیف کا موضوع نہیں ہے۔ آپ کے کمالات کا مکمل بیان وفاتر بے پایاں کا تقاضا کرتا ہے۔ بہر صورت ہم آپ کے اخلاقِ حسنہ میں سے۔ صدق اور امانت کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ حضورؐ صدیق اور امین تھے۔ ان دو صفاتِ عالیہ کا ایک پیغمبر کی زندگی میں بدرجہ اتم موجود ہونا اس لیے ضروری اور لازمی ہوتا ہے کہ ان ہی کے وجود پر اس پیغمبر کے پیغام کی صداقت اور اس پیغام کو من وعن دوسروں تک پہنچا دینے، یعنی خدا کی امانت کو خدا کے بندوں کے حوالے کر دینے کی تصدیق کا دارومدار ہوتا ہے۔ حضورؐ سچے تھے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے۔ جسے حضورؐ کا سب سے بڑا دشمن مکہ کے مشرکین کا سردار ابوجہل بھی تسلیم کرتا تھا۔ حضورؐ امین تھے۔ اسے درست تسلیم کرنے کے لیے صرف اس ارشاد کو جان لینا کافی ہے جو ہجرت کی پہلی صبح کو مکہ والوں کی امانتوں کی واپسی کا ضامن تھا۔ جو نبیؐ ایسے نازک وقت میں بھی امانت کو اس کے مالک تک پہنچانے کی سختی سے تلقین کرتا ہو۔ اور اس میں دوست دشمن کی تفریق روا نہ رکھتا ہو۔ اس کے امین ہونے میں شک کرنا انسانیت کی توہین ہے۔

ان ہی دو صفات کا وجود آپؐ کی سیرت مبارکہ کے عظیم الشان ہونے کا کافی ثبوت ہے۔ آپ کی سیرت کے یہی دو پہلو ہیں۔ جو آپؐ کے پیغام کو بھی سچائی والا پیغام منواتے ہیں۔ اور آپؐ نے تبلیغ دین فرماتے ہوئے اللہ کی مرضی کو جس خوبی سے پورا کیا ہے اس کا ایک تصور دلاتے ہیں۔ جو شخصیت بندوں کی امانتوں میں خیانت نہ کرے بندوں کے معاملات میں سچ کا دامن نہ چھوڑے۔ صرف وہی شخصیت اس دعوے کی مجاز ہوتی ہے۔ کہ اس نے خدا کی امانت میں کوئی خیانت نہیں کی ہے۔ اور خدا کے پیغام میں سچ کے ساتھ کسی مصلحت کی خاطر جھوٹ نہیں ملایا ہے۔ جو برگزیدہ ہستی بندوں کے ساتھ راست باز ہو اسے بندوں کے مالک کے معاملے میں زیادہ راست باز ہونا چاہیے۔ اور حضورؐ واقعی نہایت صادق تھے۔

لہٰذا حضورؐ کی اس سیرت مبارکہ کے مطالعہ اور یقین کے بعد ہم حضورؐ پر منزل من اللہ کلام کے سچے ہونے کا یقین حاصل کرتے ہیں۔ جن غلط بینوں کو حضرت کی سیرت میں حسن نظر نہ آئے۔ وہ کلام الٰہی کو کلام الٰہی تسلیم کب کریں گے۔ اور ان کے نزدیک حضورؐ کے پیغام کی الہامی صداقت قطعی مسلمات میں سے نہیں ہوگی۔

گویا ایمان اور تصدیق کی راہ میں کلام الٰہی (پیغام الٰہی) سے پہلے رسول اللہ کا مقام آتا ہے۔ جو خوش قسمت اس مقام اولیٰ میں حق و صداقت کی شمع سے روشنی حاصل کر پاتا ہے۔ وہ اس سے اگلی منزل پر کلام الٰہی سے مستفیض ہونے کا امیدوار اور حق دار ہو جاتا ہے۔ اور جو بدبخت اپنی شقاوت قلبی سے اس مقام اولیٰ میں شیطانی وسوسوں اور اپنی نفسانی پراگندیوں کا شکار ہو کر حق و صداقت کے اس مینارہ کبیر سے روشنی کی شعاعیں آتے دیکھ کر بھی ان کے موہوم ہونے پر فیصلہ قائم کرتا ہے۔ وہ جب اس

منزل سے بھٹکتا ہے۔ تو اسے اس کے بعد یقین وایمان کی دولت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا جاتا ہے۔

آپؐ نے فرمایا۔ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ آپؐ کو سچا ماننے والوں نے اس نزول وحی کو بھی مان لیا۔ آپؐ نے فرمایا مجھے معراج ہوئی ہے۔ آپؐ کو صدیق تسلیم کر لینے والوں نے اسے بھی تسلیم کر لیا۔ آپؐ نے فرمایا میں خدا کا آخری نبی ہوں آپؐ کو راست گفتار جاننے والوں نے اسے صحیح اور درست مان لیا۔ اور یہی طریقہ عقلی طور پر درست اور صائب تھا۔ جو آپؐ کو محض ابن عبداللہ کی حیثیت سے دیکھنے کے عادی تھے۔ جن کے ضمیر خود پرستی اور مفاد پروری کی لعنتوں نے گندے کر دیئے تھے۔ انہوں نے سُنا اور سُنی ان سُنی کر دی۔ پہلے بزرگوار مسلم کہلائے اور دوسرے ستم شعار اس نعمت عظمےٰ کا کفران کرنے کی وجہ سے کافر قرار پائے۔ ان دونوں گروہوں کا فرق اب بھی بحال ہے۔ اور انجام بھی یقیناً یکساں نہیں ہوگا۔ لا یستوی اصحاب النار و اصحاب الجنۃ، اصحاب الجنۃ ھم الفائزون۔

عرض کیا جا رہا تھا کہ ایمان لانے کی راہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ایمان لانا پہلے آتا ہے۔ اور پھر اس کے ارشادات پر ایمان لایا جاتا ہے ـــ کلام الٰہی رسولؐ کی زبانِ صداقت ترجمان سے سن کر مان لینے کے بعد ماننے والوں کے لیے کلام الٰہی ہوتا ہے۔ اور نہ ماننے والوں کے لیے کلام الٰہی ہوتے ہوئے بھی کلام الٰہی نہیں ہوتا۔

کلام اللہ کو بندوں تک پہنچاتے وقت حضورؐ نے صرف یہی نہیں کیا کہ الفاظ

سناتے جاتے تھے۔ اور ان کی توجیہ و تشریح کو سننے والوں کی صدا بدید پر چھوڑتے جاتے تھے۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو حضورؐ کی تعلیم جوں جوں پھیلتی جاتی۔ آپ کی موجودگی ہی میں اسی نسبت سے انتشار اور اختلاف پیدا ہوتا جاتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضورؐ نے زمانوں کے اختلافات مٹا دیے۔ رنگ نسل، زبان کے امتیازات ختم کر ڈالے۔ اخوت کی جہانگیری اور محبت کی فراوانی سے عرب کو بقعۂ نور بنا دیا۔ اس اتحاد اور اتفاق کی اصل حضورؐ کے ان ارشادات پر مبنی تھی۔ جو آپؐ کلام اللہ کو سمجھانے کے لیے کام میں لاتے رہے۔ ان ارشادات میں قبول کیے جانے کا جو جوہر تھا۔ وہ نور کہلایا۔ اور آپؐ نے ان ارشادات اور اپنے عمل کی بدولت انسانیت کی شاہراہ میں جو مشعلیں روشن کیں۔ ان کی بدولت اُس قرن کے مسلمین کا قلب تزکیہ کی دولت سے مالا مال ہوا۔ جنہیں تاریکی میں روشنی نظر آئی تھی۔ ان کے لیے یہی روشنی سب کچھ تھی۔ تب ہی تو حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا تھا۔ ع

صدیق کے لیے ہے خدا کا رسولؐ بس

خدا خدا ہے اور رسولؐ رسولؐ۔ رسولؐ اپنے مقام سے بلند کر کبھی خدا نہیں بن سکتا۔ اگر بن سکتا تو بھی نہ بنتا۔ اُسے خدا بننے میں کیا فائدہ۔ خدا کی بندگی میں جو درد جگر ملتا ہے۔ اس کا سرور خدائی کے ورد سر میں کہاں! ع

مقام بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

محبوبیت میں جو رعنائی ہے وہ محبیّت میں کہاں۔ عبدہٗ کا مقام ھُوْ کے سوا کون سکتا ہے۔ مگر اس ھُوْ نے اس امر کی تصریح کر دی ہے کہ عبدہٗ۔ ھُوْ نہیں۔ تاہم نرا عبد بھی نہیں ہے۔ عبدہ رسول کے ایک ایسی شخصیت ہوتی

ہے ۔ جس کے عظیم الشان ہونے کا ایمانی ویقین تو ہو سکتا ہے ۔ مگر اس عظمت و شان کی تخصیص اور تحدید انسان نہیں کر سکتا ۔ اگر وہ اپنی بے بضاعتی کا اظہار اور عجز ذاتی کا اقرار اس طرح کرے کہ عبدہٗ کو ہو قرار دے ۔ تو ہو کی شریعت اور ہو کا بتایا ہوا ہدایت نامہ اس عجز کو ناپسند کرتا ہے ۔ اس کے برعکس انسان اپنی انانیت کے سمندر میں غوطہ لگا کر یہ سمجھے کہ انا ولا غیری " انسان تو میں بھی ہوں ۔ رسول بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں ۔ مجھ میں اور ان میں کیا فرق ۔ چلو تقدم و تاخر کا فرق مان لیتے ہیں ۔ استاد اور شاگرد کا حفظِ مراتب تسلیم ہے ۔ مگر ابن عبداللہ کو ساری انسانیت میں بلند ترین مقام میں کیسے دوں ؟ ۔ اس طرح انسانیت کی ارتقاء کی توہین ہوتی ہے " تو اس مزاج کے انسان کو ہم انسانیت کے زمرہ سے تو خارج نہیں کر سکتے ۔ نہ اس کی افتاد طبع کو بدلنا ہمارے بس کا روگ ہے ۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں ۔ کہ ایاز قدر خود بشناس اس ۔ ابن آدم کی سرفرازی دیکھ ۔ یہ ابن آدم عبد ہوا و نفس نہیں ۔ عبد مولا ہے ۔ عبدہٗ ہے ۔ ہو کے ساتھ اس تعلق کو نظر انداز کرنے کا انجام ہلاکت اور تباہی ہے ۔ اور ہو کے ساتھ عبد کے اس تعلق کو پیش نظر رکھنے کا نتیجہ ابدی سعادت اور کامرانی ہے ۔

قرآن خدا کا کلام ہے ۔ ہو نے اپنی قدرت کاملہ سے اپنے ارادوں اور منشائے عزیز کو الفاظ کا جامہ پہنا کر جبرئیل کے ذریعے اپنے عبد کامل پر اتارا ہے ۔ آپ نے اس کلام کی روشنی میں انسانیت کیلئے راستہ متعین فرمایا ہے ۔ اس راستے کے سنگ میل لگاتے وقت آپ نے کلام اللہ کو پیش نظر رکھا ہے ۔ یہ مجموعہ الفاظ آپ کے عمل میں آکر مجموعہ ہدایت بنا جیسے الفاظ کو معانی سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ کہ ان کے بغیر الفاظ کا وجود ہی نہیں رہتا ۔ اسطرح معانی کو الفاظ میں تمام تر محصور اور مستور قرار

دینا بھی الفاظ کی قدر و قیمت سے انکار کرنا ہے۔ لفظ کے اندر جو معنی مستور ہوتے ہیں۔ ان کو حجاب قوس اور حجلۂ صوت سے باہر لانے کے لیے متکلم سے کہیں زیادہ مخاطب کو جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اس جدوجہد میں مخاطب کی ذہنی افتاد قلب و نظر کی وسعت، اور مزاج کی ساخت کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ اسلئے ایک لفظ کے معنی مختلف طبائع کے ہاں مختلف ہوتے ہیں۔ یہ معانی اگرچہ اس لفظ کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ جیسے کہ کسی عظیم درخت کے بیج کے اندر اس درخت کی پہنائی موجود ہوتی ہے لیکن جس طرح ایک بیج سے درخت برآمد کرنے کے لیے پانی ہوا، گرمی اور خشکی، تاریکی اور روشنی کی قوتیں جدوجہد کرتی ہیں۔ بالکل اسی طرح کلام کو سننے والی شخصیت کے قلب و نظر کی مختلف قوتیں الفاظ سے معانی نکالتی ہیں۔ ہر پیغمبر خداوند تعالیٰ کا شاگرد ہوتا ہے۔ وہ اسی سے سننا، سمجھنا، جاننا اور معلوم کرتا ہے۔ وحی کے نزول سے پہلے وہ اس قابل ہوتا ہے کہ وحی کو کماحقہٗ سمجھ سکے۔ وحی کے الفاظ سے وحی بھیجنے والے کی مرضی کے مطابق معنی نکالے۔ ظاہر ہے کہ ان مقصود و مطلوب معانی کے برآمد کرانے کے لیے قدم قدم پر کلام کا نزول نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے تو پیغمبر کے قلب پر الفاظ کے وسیلے کے بغیر وجدان کی راہ سے روشنی نازل ہوتی رہتی ہے۔ اور یہی روشنی صحیح مفہوم سمجھانے میں مدد کرتی ہے۔ اسی کا نام وحی خفی ہے۔ اور اسی کے زور سے ہر پیغمبر کلام الٰہی سے تشریع کا کام لیتا ہے۔ اور کلام کی منشاء متعین کرتا ہے۔ اس روشنی سے انکار کرنا کم علمی، بے بصیرتی، اور کج نگہی ہے۔

اسلام میں ہدایت کا سرچشمہ قرآن ہے۔ اور اس ہدایت کے سرچشمہ سے ہدایت کیسے وصول کی جائے۔ اس کا طریقہ اس چشمے سے سب سے پہلے ہدایت لینے والے پیغمبر کے اسوہ حسنہ میں موجود ہے۔ آپ نے کیسے ہدایت لی۔ دوسروں تک کیسے پہنچائی۔ آپ کس ماحول میں سے۔ آپ کے تلامذہ کیسے تھے ؟۔ آپ کے مخالف کیسے تھے۔؟۔ آپ کو کیا کیا دشواریاں پیش آئیں ؟۔ آپ کی کامیابیاں کس قسم کی تھیں۔؟۔ آپ کی جدوجہد کیسی رہی۔؟۔ آپ نے کیا کیا۔؟۔ اور آپ نے کیا فرمایا ——— اس کا جو ریکارڈ ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کا نام "احادیث" ہے۔

جو شخص اس ریکارڈ کو تلف کر دینا چاہتا ہے۔ وہ ظاہر ہے کہ ریکاڈ والے کا خیر خواہ اور دوست نہیں ہے۔ ہم نے ایسے عاشق دیکھے ہیں۔ جو محبوب کے نقشِ پا کو جبریدہ دل پر ثبت کر لینے کو کمال عاشقی سمجھتے تھے۔ بعض ایسے محب دیکھے گئے ہیں۔ جو اپنے دلدار کے صوت و لحن کی یاد کو متاعِ حیات سے عزیز سمجھتے تھے۔ جن کے لیے محبوب کے پاؤں کی ایک آہٹ اتنی عزیز تھی۔ کہ کسی مردے کے لیے عیسٰیؑ کی صدائے قم باذن اللہ اتنی جانفزا نہیں ہو گی۔

زبان سے آقائے نامدار کے عشق کا دعوٰی اور ہاتھوں میں جناب کے قصرِ رفیع کو ڈھانے کے لیے، کدال لیے پھرنا کہاں کی حق پسندی اور وفا کیشی ہے؟ یہ جاں نثاروں کا کام نہیں ہے۔ ؎

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

ان یارانِ مے کدہ سے کوئی یہ تو پوچھے کہ عزیزانِ گرامی قدر! حضورؐ نے قرآن کی جو تشریح فرمائی تھی۔ جب اسے ظنی اور وہمی قرار دیا جائے گا۔ تو خود قرآن کی حیثیت کیا رہ جائے گی۔ اس کے الفاظ تو بحال رہ جائیں گے۔ مگر ان کا ما فی الضمیر مستور ہی رہے گا۔ اس سے بڑی تاویل اور خطرناک تحریف اور کیا ہو گی۔ قرآن کے نزول کا مقصد صرف قرآن کے الفاظ کا وجود و بقا نہیں ہے۔ بلکہ ان معانی کا اجرا بھی ہے۔ جو ان الفاظ کو در پردہ کیے ہوئے ہیں۔

لیکن منکرین حدیث کا اندازِ فکر و نظر یہ ہے کہ قرآن کے معانی کو اسلام کے دور اول کے احوال و ظروف سے متعلق کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق شرع کی تدوین کرنے کے آرزو مند ہیں۔ گویا قرآن پہلی دفعہ ان ہی سے مخاطب ہوا ہے۔

ان کی کوشش کی مثال بعینہ ایسی ہے کہ آج کوئی "دانا" جدید علوم و فنون کے حاصل کردہ کمالات سے قطع نظر کر کے اپنے طور پر مختلف علوم و فنون میں تجربوں کی بنیاد رکھے۔ اور جن حقائق کا انکشاف صدیوں پہلے ہو چکا ہے۔ ان کی طرف بے بساطی کے سمند ناز کو بڑھائے اور اسے علمی تحقیق کو تلاش حق کا نام دے۔

آج جب کہ بجلی کے فوائد سے سارا جہاں واقف ہے۔ وہ مسخرا بجلی کے ہر طرح کے استعمال کو ناجائز

قرار دے۔ برقی قمقموں کی جگہ موم بتیاں جلانا ضروری سمجھے۔ ہوائی جہاز میں سفر کو تب جائز سمجھے جب پہلے غبارے کا سفر کر لیا گیا ہو۔ نئی طرز کی موٹر پر سوار ہونا صرف اسی کے لیے واجب گردانے جو بیل گاڑی میں بیٹھ چکا ہو۔

منکرین حدیث قرآن کا مفہوم واضح کرتے وقت تمام سابقہ کوششوں کو، اور تمام علمی سرمائے کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ روش بے سود بھی ہے اور ناپسندیدہ بھی

آئندہ صفحات پر ان کے مزاج تحقیق اور مشرب کی چند تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ اس کے مطالعہ پر یہ فیصلہ کرنا آپ کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے کہ یہ کرم فرما اسلام کے شیدائی ہیں یا دین کے دشمن۔ ان کے ہاتھوں میں قلم ہیں یا قصر رسالت کو ڈھانے کے پھاوڑے۔ ان کی زبانیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں مصروف ہیں۔ یا ان قینچیوں سے ردائے اسلام پارہ پارہ کی جا رہی ہے۔ ان کے چھاپہ خانے تبلیغی لٹریچر چھاپ رہے ہیں۔ یا اسلامی افکار

کے راستے میں پروپیگنڈے کی نیند سکندری کھڑی کر رہے ہیں۔

محمد فرمان

غازی ——— ہزارہ

۲۷ر رمضان المبارک

۱۳۸۳ھ

منکرینِ حدیث کا امام الائمہ نیازؔ فتحپوری

مدیر نگار کی

دین سے بے نیازی

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی

جن لوگوں نے نگار کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ اس امر سے بخوبی واقف ہوں گے کہ نیاز صاحب نے مذہب کے خلاف ایک مہم عرصے سے جاری کر رکھی ہے۔ ان کے حملہ کا انداز جدید منکرین حدیث سے دو حیثیتوں میں مختلف ہے۔ پہلی حیثیت یہ ہے کہ مدیر نگار اپنی ذاتی رائے کو بلا کسی قسم کے خوف کے واضح طور پر ظاہر کرتے ہیں انہیں دین سے جس درجہ کی بدظنی ہو وہ اس کا بیان لگی لپٹی رکھے بغیر کر دیتے ہیں۔ ان کی دوسری امتیازی حیثیت یہ ہے کہ وہ حدیث کو قطعًا ناقابل قبول سمجھتے ہیں اور جدید منکرین کی طرح کبھی اس کے حق میں اور کبھی اس کے خلاف نہیں لکھتے بلکہ ہمیشہ واشگاف

الفاظ میں اس مجموعے کو غیر یقینی اور ظنی قرار دیتے ہیں *
گویا وہ اسلام کے دشمن تو ہیں لیکن ان کی دشمنی ظاہر ہونے کی وجہ سے اتنی خطرناک نہیں ہے۔ اس کے برعکس جدید منکرین حدیث بظاہر مسلمانوں کے ہمدرد۔ ناصح اور اسلام کے غمخوار نظر آتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں اسلام کے ایسے خطرناک دشمن ہیں جو اس خطہ زمین سے اسلام کا نام و نشان تک مٹا دینے کے درپے ہیں *

نیاز صاحب کو اس میدان میں جو تخصیص حاصل ہے اُس کا اظہار کرنے کے بعد یہ واضح کر دینا بھی نہایت ضروری ہے کہ وہ دوسرے جملہ معاملات میں جدید منکرین کے سے انداز فکر کے مالک ہیں *

ہم ناظرین کی معلومات کے لئے نیاز صاحب کی کتاب من یزداں (کال) سے چند حوالے پیش کرتے ہیں۔ ان سے نیاز صاحب کے ایمان کی ایک تصویر آپ کے سامنے منتقل ہو جائے گی۔ اس کتاب کے شروع میں وہ لکھتے ہیں :-

انجیل انسانیت = مذہب انسانیت کا پہلا اور آخری صحیفہ اس ابتداء کو دیکھتے ہی صاحب کتاب کے مزاج، افتاد طبع، عقیدہ، ادّعا اور طریق کار کا ایک ہلکا سا تصور کیا جا سکتا ہے گویا نیاز صاحب کے نزدیک انسانیت کے دُکھ درد اور ضروریات کا علاج ان کی اس تصنیف سے پہلے سوچا ہی نہیں گیا اور نہ آئندہ ایسا سوچا جانا ممکن ہے۔ لہذا ان کی انجیل انسانیت صحیفہ

ہے پہلا اور آخری۔

اس ادعا کے باوجود نیاز صاحب اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ اور اس وقت کے علماء مثلاً سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی صاحب کو ملا کہتے ہیں۔

ان کے ارشادات کے مطالعہ پر ایک غیر جانبدار، غیر متعصب اور انصاف پسند قاری اپنی رائے قائم کرنے میں آزاد ہے کہ نیاز صاحب اسلام کے دشمن ہیں یا دوست۔ نیز اس وقت کے علماء انہیں اس "راہ جدیدہ" سے ہٹنے کے لیے اگر روکتے ٹوکتے تھے تو وہ حق بجانب تھے۔ یا نہیں؟

نیز نیاز صاحب ایسے اسلام کے محسنوں سے جو لوگ اسلامی مسائل حل کرانے کے خواہاں تھے وہ دانا تھے یا سادہ لوح، اور آج پاکستان میں جو بزرگوار حدیث کا انکار کرتے وقت نیاز صاحب کے اعتراضات کو دہرایا کرتے ہیں وہ اسلام پسندوں کی نظر میں عزت اور وقار کے حقدار ہیں یا اعتراض اور تنقید کے طلب گار ——— اور جن لوگوں کا قرآن اور اسلام کے بارے میں یہ نظریہ ہو (جس کا اظہار نیاز صاحب نے کھلم کھلا کیا ہے) وہ صرف حدیث کے مخالف ہیں ۔ یا حدیث اور قرآن دونوں کے؟

نیاز صاحب انجیل انسانیت میں لکھتے ہیں:۔

"میری نامسلمانی کی تاریخ بہت دلچسپ ہے۔ میرے والد صاحب سخت مذہبی انسان تھے ——— میری عمر ۶ - ۷ سال سے زیادہ نہ تھی لیکن وہ اس وقت بھی جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے پر مجبور کرتے تھے ——— میری ابتدائی تعلیم نہایت سخت مذہبی ماحول میں ہوئی۔۔ اور ایک نہایت متعصب مسلمان ہونے کی حیثیت سے

میرا نشوونما ہونے لگا۔ میں نماز بھی پڑھتا تھا۔ روزے بھی رکھتا تھا۔ ظاہری وضع و لباس میں بھی سر سے پاؤں تک نہایت خشک و بھیانک قسم کا مسلمان تھا۔ اور چونکہ صحبت عالموں اور مولویوں ہی کی تھی۔ اس لئے شب و روز میرے دل و دماغ پر مذہب مسلط تھا۔ اور میں دنیا کی ہر بات کو مذہب ہی کے نقطہ نظر سے دیکھتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات ضرور دل میں کھٹکتی رہتی تھی کہ مذہبی لوگوں اور مولویوں کے اخلاق پست کیوں ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ ان کی رعونت اور ان کا پندار تفوق —— یہ تھی ابتدا میرے تنفر کی جو مولویوں کی طرف سے مجھ میں پیدا ہوا۔ یہاں تک کہ احادیث کا نصاب میرے سامنے آیا اور مشکوٰۃ کا درس شروع ہوا۔ چونکہ اب مجھ میں غور و فکر کی اہلیت زیادہ پیدا ہو گئی تھی اس لیے خود میری عقل نے فیصلہ کیا۔ یہ تمام احادیث یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ ان میں سے اکثر بالکل طفلانہ خیالات کا مجموعہ ہیں۔ اور جب میں نے اپنے شبہات اساتذہ کے سامنے پیش کیے —— تو انہوں نے زجر و توبیخ کے علاوہ کوئی تشفی بخش جواب نہ دیا۔ اور ہمیشہ یہی کہہ کر خاموش کرنا چاہا کہ مذہب میں عقل آرائی کافروں اور ملحدوں کا کام ہے ——

اولین بیزاری اسلامی لٹریچر کی طرف سے مجھ میں احادیث نے پیدا کی[1]۔ اس بیزاری کا موازنہ آپ برق صاحب کی بیزاری سے کریں ان دونوں کی بیزاری کے خدوخال کس درجہ ہم رنگ ہیں۔ اور ان بیزاروں کے "خلوص" کا ظہور کتنا دلچسپ ہے۔

جب آپ دور جدید کے منکرین حدیث کے اعتراضات کا مطالعہ کریں گے تو آپ کو ان کی نگارشات میں نیاز صاحب کے خیالات کا اعادہ بکثرت ملے گا۔ فرق

---

[1] ایضاً صفحہ ۴۹۵ —— ۴۹۶

صرف یہ ہے کہ نیاز صاحب کی بے دینی اتنی آشکارا اور مبرہن ہے کہ جدید منکرین حدیث کے مفاد و مصلحت کی رو سے اس بے دینی کا کھلم کھلا اقرار اور اعادہ غیر ضروری ہوگیا ہے۔ بعض غیر جانبدار حضرات کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ جو لوگ حدیث پر تنقید کے خواہاں ہیں انہیں منکرین حدیث یا منکرین رسالت کہنا مناسب نہیں ہے۔ آپ آئندہ چند صفحات مطالعہ فرمائیں اور خود فیصلہ کریں کہ یہ بزرگوار منکرین حدیث کے لقب کے حق دار ہیں یا محض تعصب کی بنا پر انہیں یہ سرفرازی عطا ہوئی ہے۔

لکھتے ہیں :۔

"پھر جب خدا سب کا ہے — تمام مخلوق اسی کی ہے۔ اس کو نہ مذہب سے فائدہ پہونچتا ہے نہ لا مذہب سے نقصان۔ تو پھر یہ مصیبت کیوں، یہ تفوق و برتری کا غلط معیار کیا ؟ ۔ طریق عبادت کے اختلاف پر جنگ کیا معنی، وضع و لباس کی تفریق، تمدن و معاشرت کے امتیازات پر آویزش کیسی[1] ؟

گویا نہ مذہب کی تفریق درست ہے نہ عبادت کا کوئی طریقہ صحیح ہے۔

"ظاہر ہے کہ جو تعلیم صرف جذبہ خوف و ہراس کی پیدا کرنے والی ہوگی وہ کبھی بنی نوع انسان کی ترقی کی ذمہ دار نہیں ہو سکتی۔ اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے۔ کہ مذہب نام ہے اس غلامانہ ذہنیت کا جو صرف خوف و بزدلی، یاس و بیچارگی، غربت و مسکنت پیدا کرتی ہے۔ اور جرأت و ہمت کے ان جذبات

---

[1] ص ۱۰ مضمون خدا ہے یا نہیں ؟

ہے جن پر تمام ترقیوں کا انحصار ہے - انسان کو محروم کر دیتی ہے - مانا کہ خدا سب سے بڑا ہے - اور انسان اس کا سب سے حقیر غلام - لیکن سوال یہ ہے کہ کیا غلامی کبھی کسی نوعیت سے خوشگوار چیز ہو سکتی ہے؟ آقا خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ؟ ؎۱

گویا مذہب کا کام ہے بزدلی پیدا کرنا اور غلامی کو جنم دینا مسکینی اور غریبی اس کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے - برق صاحب بھی غریب مسلمانوں کا تمسخر اڑاتے وقت یہی تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں -

"اب رہا یہ سوال کہ میں آخرت کو کیوں نہیں مانتا یعنی قیامت اور جزا و سزا کے نظریہ کو کیوں قابلِ قبول نہیں جانتا - اس کے متعلق آپ مجھ سے کوئی استفسار نہ کیجئے - بلکہ خود ان تمام روایات کو تفصیلی طور پر مطالعہ کیجئے - جو اس باب میں ...... بیان کی جاتی ہیں کہ مرنے کے بعد سے لے کر دوزخ یا جنت میں پہنچنے تک کیا کیا مراحل و منازل سامنے آتے ہیں - اور پھر خود ہی اپنی عقل سے کام لے کر فیصلہ کیجئے کہ باور کرنے کے لائق ہیں یا نہیں ؎۲

یہ مسلمان قیامت اور جزا و سزا پہ ایمان نہیں رکھتا - برق صاحب نے قیامت اور جزا و سزا کے متعلق جو فرمایا ہے - وہ آپ متعلقہ صفحہ بغور ملاحظہ فرمائیں - اس کے بعد یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گی کہ اس ہم آہنگی کی وجہ کیا ہے -

---

؎۱ ایضاً ۱۸۹

؎۲ ایضاً ۲۱۵

"اس میں شک کرنے کی گنجائش نہیں کہ سب جتنے مذہبی معتقدات دنیا میں پیدا ہوئے ہیں۔ وہ سب نتیجہ ہیں قیاس کا اور چونکہ قیاس کا تعلق موجودات کے تصورات سے ہوا کرتا ہے۔ اس لیے حیات مابعد الموت کے متعلق بھی ایک انسان نے اپنے قیاس سے کام لے کر وہی باتیں کہیں جو دنیاوی زندگی میں پیش آتی ہیں"۔ ؎

دینی باتوں کو قیاس کا نتیجہ قرار دینا جدید منکرین کے ہاں عام بات ہے وہ جب احادیث کو ظنی قرار دے رہے ہوں تو آپ کو نیاز صاحب کی آواز ان کی آواز میں سنائی دے گی۔

"جس حد تک روحانیت کا تعلق ہے۔ مذہب جس میں ظاہری مراسم وشعائر کی پابندی ضروری ہے۔ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ مادی نظر سے اس کی ناکامی کسی سے مخفی نہیں۔ کہ آج تک وہ قوی کے مقابلہ میں ضعیف کو پامالی سے نہ بچا سکا۔ نفسیاتی زاویہ نگاہ سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی خصوصیات علمی وتمدنی ترقی کے لیے بہت خارج ہیں۔ رہی وجدانی و مابعد الطبیعاتی تسکین۔ سو یہ علم الاخلاق کی وسعت سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جو عام اخوت انسانی کے رشتہ کو قائم کرنا چاہتی ہے۔ الغرض اس وقت مغرب کی علمی دنیا میں جو جدید مذہب پھیلتا جا رہا ہے وہ "اشتراکیت" ہے۔ جس کا پیغمبر لینن اور جس کی شریعت سائنس ہے۔ پھر مذہبی نظام کے خلاف یہ ہیجان صرف یورپ و امریکہ ہی میں محدود نہیں ہے بلکہ ایشیا میں بھی پایا جاتا ہے۔ ترکی اپنی قومی ترقی واصلاح کے لیے اسلام کو پس پشت ڈال چکا ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں مصطفےٰ کمال نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ کانسٹی ٹیوشن میں اس امر کا اظہار

؎ ایضاً ص ۲۳

کہ تم کی اسلامی حکومت ہے۔ ایک ایسی بات کا اظہار ہے جس کو اولین مناسب فرصت میں کالعدم ہو جانا چاہیئے۔" ۱

نیاز صاحب مذہب کو کسی وجہ سے بھی فائدہ مند نہیں سمجھتے ان کے ہاں نہ یہ اخلاق سنوارنے میں مدد دیتا ہے نہ مادی زندگی کی خوشحالی لاتا ہے خوشحالی تو روسی نظام میں ہے۔

نیاز صاحب نے تو اعلانیہ طور پہ دل کی بات کا اظہار کر دیا ہے۔ لیکن جدید منکرین اتنے نادان نہیں ہیں کہ اس راز کو آشکارا کریں۔

"دنیا میں سب سے آخری قابلِ ذکر مذہب اسلام ہوا ہے۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مذاہب کی دنیا میں آخری لفظ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ نہ اپنے معتقداتِ دینی کے لحاظ سے وہ سب کے لیے قابلِ قبول ہے۔ اور نہ شریعت کے اعتبار سے اسے مکمل کہا جا سکتا ہے" ۲

چلئے اس مسلمان کے نزدیک اسلام آخری قابل ذکر مذہب بھی ہے۔ اور ناقابلِ قبول بھی۔

" بعض مادی اجزا کے باہمی تفاعل یا عناصر کے امتزاج سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کا نام زندگی یا روح ہے اور جب وہ امتزاج باقی نہیں رہتا تو وہ کیفیت بھی فنا ہو جاتی ہے۔ ۳

یعنی روح موت کے بعد باقی نہیں رہتی۔ لہذا یہی دنیا ہے جس کی زندگی

---

۱ ایضاً ص ۲۴۶ ۲ ایضاً ص ۲۷۲ ۳ ایضاً ص ۲۸۹

اچھی گزر رہی ہے۔ وہی ناجی ہے۔

"موجودہ انسان میں معلوم نہیں کتنے گذشتہ انسانوں اور جانوروں کے اجزا شامل ہیں۔ اس لیے اگر حشر اجساد کو تسلیم کیا جائے۔ تو وہ کون سا کیمیائی طریقہ ہوگا جو لاکھوں سال قبل کے انسانوں کے تقسیم شدہ اجزا کو پھر فراہم کر سکے گا۔ اور اگر میرا یہ حشر ہوا تو کن کن جانوروں، کن کن درختوں۔ اور کن کن انسانوں سے میرے اجزاء فراہم کر کے میرا اصلی جسم تیار کیا جائے گا" [1]

گویا حشر اجساد نہیں ہو سکتا۔ کفار مکہ بھی یہی "فرمایا" کرتے تھے،

"چونکہ خدا اور مذہب صرف عقل انسانی کی پیداوار ہے۔ اور عقل انسانی مختلف حالات کے تحت ہمیشہ مختلف رہی ہے۔ اس لیے اگر آج عقاید مذہبی میں تمام افراد نوع انسان ایک دوسرے سے متفق نہیں ہیں۔ تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔ البتہ اگر دنیا یہ سمجھ لے کہ مذہب کا وجود انسانی زندگی کے لیے ضروری نہیں ہے۔ اور ہم خدا کو مانے بغیر بھی اچھی زندگی بسر کر سکتے ہیں تو بے شک یہ ایک ایسے نقطہ کی طرف قدم بڑھانا ہوگا۔ جو عقائد مذہبی کے تمام لغو اختلافات کو دور کر کے مذہبی حیثیت اختیار کر سکتا ہے۔" [2]

یعنی مذہبی عقائد لغویات ہیں۔ اور مذہب ہی اختلافات کی بنیاد ہے۔ جدید منکرین یہ تو نہیں کہہ سکتے۔ البتہ وہ حدیثوں کو اختلافات کا ضامن ٹھہراتے ہیں۔

---

[1] ایضاً ص ۳۳ [2] ایضاً ص ۳۶

"مذہب کا زوال یقینی ہے۔ اس کے ساتھ واقعات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خدا پرستی کا زوال بھی لازمی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ گذشتہ ۵۰ برس سے وحدانیت کس طرح اپنی جگہ پر قائم ہے اور الحاد کتنا پھیل رہا ہے۔ لہذا اب جب کہ علم عام ہو رہا ہے۔ مستقبل کا حال ظاہر ہے۔ خدا کے خیال کو خواہ کتنا ہی پاکیزہ کیوں نہ بنایا جائے مگر اب وہ باقی نہیں رہ سکتا" لہ

چونکہ اس زمانے میں توحید بقول نیاز صاحب اپنی جگہ پر قائم ہے۔ لہذا مذہب (ان کے خیال میں) باقی نہیں رہے گا۔

"یاد رکھیئے کہ مذہب کا خاتمہ وہ مبارک گھڑی ہوگی جب ہم مردہ انسانوں سے مدد مانگنے کے بجائے اپنی عقل سے امداد کے طالب ہوں گے۔ اور ہم میں ایک ایسی زندگی پیدا ہو جائے گی۔ جو تمام زندگیوں سے لطیف تر، خوش گوار تر اور مرغوب تر ہوگی" ٢ه

اگر ایسے "بزرگوار" حدیث کو مٹانے پر تلے بیٹھے ہوں۔ تو اتنی حیرانی کی بات نہیں ہے

"حقیقت یہ ہے کہ خدا کو انسان ہی نے پیدا کیا ہے اور بڑی حد تک اپنی ہی طرح سے انسان سمجھا عہد وحشت کے انسان نے جو تصور خدا کا پیش کیا ہے اس میں بھی وہی وحشت اور درماندگی پائی جاتی تھی۔ اس کے بعد جب انسان نے کچھ ترقی کی تو خدا بھی ایک حد تک ترقی یافتہ ہو گیا۔ اس کی وحشت کم کر کے تھوڑا سا رحم بھی اس کے دل میں ڈال دیا گیا،" ٣ه

لہ ایضاً ص ۳۱۵ ٢ه ایضاً ص ۱۴۶ ٣ه ایضاً ص ۱۴۳

دنیا کہتی ہے کہ خدا نے کائنات اور انسان کو پیدا کیا۔ یہ منکر حدیث و قرآن مسلمانی کا دعوے کرنے کے باوجود "فرماتا" ہے کہ خدا انسانی ذہن کی پیداوار ہے۔ اگر ان کے مرید ان دنوں یہ فرما رہے ہیں کہ حدیثیں وضعی ہیں۔ اور انسانی تراش کا نتیجہ ہیں تو خدا پرستو تم حیران کیوں ہو۔ اور پریشان کس لیے ہو۔ ان کے پیر ومرشد کے ارشادات ان سے بھی زیادہ نرالے، دلچسپ اور معرفت سے لبریز ہیں۔

دو تاریخ کے صفحات اٹھا کر دیکھئے کہ مسلمانوں کے زوال کی تاریخ کب سے شروع ہوئی ہے اور خود ہی فیصلہ کیجئے۔ کہ کیا اس کی ابتدا علماء مذہب سے نہیں ہوئی۔ اور کیا ذہنی غلامی کی بنیاد ڈالنے والی کوئی اور جماعت تھی؛ بنو امیہ کی سلطنت کو تباہ کرنے والے، بنو عباس کی حکومت کا تختہ الٹنے والے یہی لوگ تھے جو شاہان وقت کی ناجائز خواہشوں کی تکمیل کے لیے بھی حدیثیں گھڑا کرتے تھے۔ اور جنہوں نے صرف طمع نفس کی بنا پر رفتہ رفتہ اسلام کے لٹریچر کو اس قدر گندگی سے آلودہ کر دیا کہ آج اس کے صحیح خط و خال کا مطالعہ از بس دشوار ہے (علماء سے یہ بیزاری کس لیے ہے ملاحظہ ہو) یقیناً اس وقت تمام دنیا کے مسلمان ایک رشتے سے وابستہ نہیں ہیں۔ اور نہ ایسا ممکن ہے۔ لیکن اس کا علاج نہ پان اسلام ازم سے ممکن ہے نہ فلسطین میں کسی یونیورسٹی کے قیام سے۔ بلکہ اس کا تعلق صرف احساس وطینت سے ہے۔ اور افسوس ہے کہ ہندوستان کا بد نصیب مسلمان اس احساس سے محروم ہے اور اب تک یہ سودا اس کے دماغ سے نہیں نکلا کہ وہ

ہندوستان میں حکمران ہو کر آیا تھا اور حکمران قوم کا فرد ہونے کی حیثیت سے اس کو ایسا تفوق حاصل ہے جس کے سامنے یہاں کے تمام باشندوں کو اس کے سامنے گردن جھکا دینا چاہیئے۔ ہندوستان میں صدیوں تک قیام کرنے کے بعد یہ اجنبیت کیوں ہے؟ اس کا سر رشتہ بھی علماء مذہب کے ہاتھ میں ہے جنہوں نے سر زمین ہند کو دارالحرب و کفرستان - اور یہاں کے رہنے والے کو ہمیشہ کافر..... کہہ کر اختلاف و دشمنی کی وسیع خلیج حائل کر دی درآں حالیکہ نہ ہندوستان کفرستان ہے اور نہ ہندو، کافر و مشرک، ایک ہندو مندر میں جا کر بت کے سامنے جھک جاتا ہے تو کافر ہے۔ لیکن ایک مسلمان مسجد میں جا کر محراب کے سامنے سر بسجود ہو جاتا ہے تو کافر نہیں ایک ہندو پتھر کی مورتی کو بوسہ دیتا ہے تو مشرک ہے۔ لیکن ایک مسلمان طواف کعبہ کے وقت سنگ اسود کو چومتا ہے تو مشرک نہیں کیوں؟ — بہر حال مدعا یہ ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی آبادیوں میں تفریق و اختلاف کا سبب صرف مذہب کی وہ غلط تعبیر ہے۔ جو ہندوستان میں دونوں کے علماء مذہب کی طرف سے پیش کی گئی اور اب تک پیش کی جاتی ہے۔ اس لیے اگر ہندوستان کی ترقی و آزادی کے لیے ہندوستان کا اتحاد ضروری ہے تو سب سے پہلے دونوں جماعتوں کو مذہبی تعصب ترک کر کے اپنا شعار صرف انسانیت کی پرستش قرار دینا چاہیے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے۔ جب پنڈتوں کی گرفت سے ہندو اور علماء کے چنگل سے مسلمان آزاد ہو جائیں۔"[1]

نیاز صاحب کا فتوائے علماء اور حدیث کے حق میں دیکھ لیا۔ پاکستان کا یہ

---

[1] ایضاً ص ۱۷۷-۱۷۸

دشمن تو اعلانیہ دشمن ہے مگر اس کے مرید پاکستان کی دوستی کا دم بھرتے ہیں

اس دور کے منکرین حدیث کی آواز ان ارشادات سے کتنی ملتی جلتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پاکستان کے منکرین حدیث دو قومی نظریہ کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت نہیں رکھتے کہ اسطرح حکومت کے بھی خلاف ہو گا ــــــ اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی اسے اس لیے ناپسند کرے گا کہ اقبال مرحوم نے اس مسئلے کو ایسا صاف کیا ہے کہ اب اسے آسانی سے غلط مبحث کی بھینٹ نہیں چڑھایا جا سکتا۔ غرض دونوں کی یہی ہے کہ علماء سے مسلمانوں کو بدظن کیا جائے۔ ہندوستان کے "کرم فرماؤں" کا یہ غیظ و غضب پاکستان کو وجود میں آنے سے روکنے کیلئے تھا۔ اور ہمارے "منکرین حدیث" کا مقصد یہ ہے کہ وہ اس ملک میں صحیح اسلامی نظریات کے مطابق آئین نہ بننے دیں۔ اگر وہ اسلامی آئین کے غیر ممکن ہونے پر اظہار خیال کرتے ہیں تو ان کی غرض و غایت پوری ہونے کے امکانات روشن نہیں رہتے اور عام مخالفت کا سدِّ باب ان سے نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا انہوں نے یہ روش اختیار کر رکھی ہے۔ کہ حدیث کے سرمایہ پر ایسی ضرب لگائی جائے کہ پڑھا لکھا طبقہ اگر اسلام سے بیزار نہ ہو تو کوئی بات نہیں کم از کم اسلامی آئین سے تو بے تعلق ہو جائے۔

جب علمائے اسلام نے نیاز صاحب کی تحریروں کا نوٹس لیا۔ تو انہوں نے اپنی صفائی میں فرمایا:۔

"یہ کہنا بھی سخت غلط بیانی ہے کہ میں امام بخاری کا مخالف ہوں۔ میں صرف

یہ کہتا ہوں کہ نہ صرف بخاری بلکہ تمام کتب احادیث بحالت موجودہ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ ان پر کلیۃً اعتماد کر کے کسی مذہب کے اصول کو پیش کیا جا سکے"۔ [۱]

جو صاحب قرآن اور اسلام کا مخالف ہو۔ وہ اگر امام بخاری کا مخالف ہوا تو کیا فرق پڑے گا۔

"میرا دعوےٰ یہ ہے کہ تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی صرف ایک مذہب ایسا ہے۔ جو وقت و زمانہ کا ساتھ دینے والا ہے اور یہی ایک تنہا مسلک ہے جس نے اخوت عامہ، اور انسانیت کبریٰ کو منزل حقیقی قرار دے کر ساری دنیا کو اشتراک عمل کی دعوت دی، اور اسی اعتقاد و یقین کے ساتھ میں تمام اصول و شعائر پر نگاہ ڈالتا ہوں۔ یوں تو ایک مولوی بھی بظاہر یہی کہتا ہے۔ کیونکہ جب تک وہ یہ دعوےٰ نہ کرے۔ مذہب اسلام کا امتیاز اور اس کی ہمہ گیری کیونکر ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن جس وقت اصول و عقائد، شعائر و عمل کا سوال آتا ہے۔ تو پھر اس کا چہرہ بے نقاب ہو جاتا ہے۔ جو یقیناً کسی پیرو اسلام کا نہیں ہو سکتا اس لئے اس وقت جو بر ہمی علماء کرام کی میرے خلاف ہے۔ اس کا سبب حقیقتاً یہ نہیں ہے کہ میں اسلام کا مخالف ہوں۔ بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں کیوں ان کے سامنے سر بسجود نہیں ہوتا۔ اور میں کیوں اسلام کو ان کے عقول کا پابند نہیں سمجھتا"۔ [۲]

نیاز صاحب۔ دعوےٰ سچا ہے۔ مگر توجیہ خطرناک ہے۔ آپ جب خدا، قرآن اور مذہب سے بیزار ہیں تو کسی کے آگے جھکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

---

[۱] ایضاً ص۹۳ [۲] ایضاً ص۹۶

منکرین کی یہ روش پختہ اور پرانی ہے۔ وہ صحیح بات کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اس گریز کو یہ کہہ کر حسن قرار دیتے ہیں کہ ہم کسی مولوی کے آگے نہیں جھک سکتے۔ ڈاکٹر عبدالودود صاحب نے حدیث کے موضوع پہ بحث کے دوران میں مولانا مودودی صاحب سے یہی فرمایا تھا (ملاحظہ ہو منصب رسالت نمبر۔ ترجمان القرآن ستمبر ۶۱ صفحہ ۱۰۶)۔

"آج زمانہ جس دورِ اضطراب سے گزر رہا ہے۔ اس کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ پھر کوئی بت شکن نبی پیدا ہو۔ بلکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ کوئی مذہب شکن رسول آئے اور دنیا سے مذہبیت کی اس گرانباری کو دور کر دے۔ جس نے دنیا کا امن و سکون غارت کر رکھا ہے" ؎۱

دیکھئے اس اسلام پسند صاحب نے کیسا عمدہ پینترا بدلا ہے۔ دنیا کی بدامنی کی آڑ لے کر مذہب سے بیزاری کا اعلان کس درجہ ابلہ فریب، اور "معصومانہ" اعلان ہے۔

"میں سچ کہتا ہوں کہ مولویوں کی جنگ مجھ سے نہ مذہب سے کوئی تعلق رکھتی ہے نہ دین کی ہمدردی سے۔ بلکہ یہ حربہ ان کا صرف اس لیے ہے کہ میں ان کے خلاف کیوں لکھتا ہوں۔ ان کی حقیقتوں کو کیوں بے نقاب کرتا ہوں۔" ؎۲

آپ انصاف کی نظر سے دیکھ کر فیصلہ کریں۔ کہ نیاز صاحب سے مولویوں کی جنگ کس وجہ سے تھی۔ دین کی خاطر یا ان کی ذات کی خاطر۔

"آپ کسی بڑی سے بڑی مسجد کا اجتماع جا کر دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ بہت سے

؎۱ ایضاً صفحہ ۱۳ ؎۲ صفحہ ۱۳

جانور کسی احاطہ کے اندر جمع کر دیئے گئے ہیں اور ایک ہی صف میں پاس پاس بیٹھنے والوں کو بھی ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر نہیں ہے۔ اگر مسجدوں کا یہ اجتماع بجائے روزانہ پانچ مرتبہ کے ہفتہ میں صرف ایک ہی بار ہو۔ اور سجدہ و رکوع کی جگہ وہ آپس میں بیٹھ کر تبادلہ خیال کریں ــ اور اپنے اپنے محلہ کے بچوں کی تعلیم، بیواؤں کی پرورش وغیرہ ..... کے لیے لائحہ عمل بھی تیار کرتے رہیں تو کتنا فائدہ عظیم مترتب ہو سکتا ہے،، [1]

بندہ پرور! مسجد میں جانے والے جانور ہوئے۔ تو مے خانہ والے انسان ہوں گے۔ بظاہر یہ تاثر پیدا کیا ہے کہ تبادلہ خیال کرتے تو مسجدوں کا فائدہ تھا۔ چونکہ لائحہ عمل تیار نہیں کرتے۔ اس لیے یہ اجتماعات جانوروں کے سے ہیں۔ مسجد میں جانے والوں کے بارے میں اس قسم کے ارشادات آپ کو برق صاحب کے ہاں بھی ملیں گے ــ نیز پرویز صاحب جب کسی دینی کام کے سرانجام دینے میں نقص بتا رہے ہوتے ہیں تو ان کا مصلحانہ لہجہ بھی اس قسم کا ہوتا ہے۔ کہ نماز، روزہ، حج کا ظاہری احترام بھی رہنے دیا جائے اور ان کی جڑ بھی کاٹ دی جائے۔

"آج ہمارے علماء کرام ہم سے نمازیں تو پڑھوا لیتے ہیں لیکن یہ نہیں بتاتے کہ کس نعمت کے شکریہ میں ان متواتر سجدوں کا خراج ہم سے وصول کیا جاتا ہے۔ روزے تو ہم پر ہر سال مسلّط کر دیتے ہیں۔ مگر اس کی کوئی تدبیر نہیں بتاتے کہ احترام ماہ صیام کے احساس کے لیے گزشتہ گیارہ

---

[1] ایضاً ص۲۵۵

مہینوں تک شکم سیر ہو کر کھانے کے ذرائع مسلمان کو کیونکر حاصل ہو سکتے ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ حصولِ نعمت و رزق کا ذریعہ یہی ہے تو پھر ہم کو معلوم ہونا چاہیے کہ آج یہ ذریعہ کیوں بیکار ہو کر رہ گیا ہے۔ اور علمائے کرام کو چھوڑ کر وہی لوگ کیوں زیادہ نکبت زدہ نظر آتے ہیں۔ جو زیادہ نمازیں پڑھتے ہیں " ؎۱

برق صاحب کو بھی یہی شکایت ہے۔ مسلمانوں کی مفلسی کا راگ الاپ پر رحم و کرم، ہمدردی کے جذبات سے اپیل کرتے ہیں، اور یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں کہ مسلمان مذہب کی وجہ سے ذلیل ہے اور دوسری اقوام جدید سائنس اور علوم کی بدولت عروج پذیر ہیں۔

" میرے نزدیک حکومت و ملک گیری قطعاً روح اسلام کے منافی نہیں لیکن رسول اللہ کی رحلت کے بعد ہی ایک اور چیز ضرور نئی پیدا ہوئی۔ جو یقیناً بہت خراب تھی۔ اتنی خراب کہ آخر کار اس نے اسلام اور اہل اسلام کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ وہ چیز کیا تھی؟ ــــ مولویت ــــ چنانچہ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی ــــ مسالک کی تفریق، اشاعرہ معتزلہ کی تقسیم، اہلِ قرآن و اہل حدیث کی باہمی اختلاف، شیعہ، سنی کی جنگ اور اسی طرح اور بہت سے فتنے اس مولویت کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ اور کتنا زہر اسے ابھی پھیلانا ہے ــــ مسلمان کے معنی ہے۔ صرف ایک صحیح "متمدن انسان ... کے ہیں لیکن خانۂ مولویت خراب ہے، اس نے اسلام کی جو راہ متعین کر رکھی ہے۔ وہ اس قدر دشوار گزار ہے کہ ایک ذی عقل و باہوش انسان دنیا میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن مسلمان

؎۱ ایضاً صفحہ ۲۳

کبھی نہیں بن سکتا۔ کیونکہ ان مفتیانِ شرعِ متین کی مرضی کے مطابق کوئی شخص مسلمان ہو ہی نہیں سکتا۔ جب تک وہ پہلے عقل و فراست کو خیرباد نہ کہہ دے۔ اور ظاہر ہے کہ اتنی بڑی قربانی کے لیے ہر شخص اتنی بڑی داڑھی کہاں سے لا سکتا ہے "۔ ؎

دیکھا آپ نے ـــ یہ لوگ ملّا کسے کہتے ہیں ـــ ان تمام اصحابؓ، تابعین، تبعِ تابعین، آئمہ فقہ و محدثین، اور علماء کرام کو جو مذہب کی خدمت کرتے رہے ہیں۔ یہی صاحب جملہ اختلافات کی وجہ مذہب کو قرار دیتے ہیں۔ لیکن وہاں مصلحت سے مذہب کو عام معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ کہ اہل اسلام کو زیادہ شکایت نہ ہو۔ اور جب موقع ملتا ہے۔ تو اس کسر کو یوں پورا کر لیتے ہیں، آپ جدید منکرینِ حدیث کے ہاں اس اعتراض کی تکرار عام پائیں گے۔ ان کا یہ اعتراض ملّا پر نہیں ہے۔ دراصل مذہب اسلام پر ہے۔

" دنیا میں بت پرستی اب بھی قائم ہے۔ لیکن مورتیوں کی صورت میں نہیں، بت شکنی اب بھی ضروری ہے۔ لیکن تیشہ آہنی سے نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ بت کہاں اور کن کن شکلوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بت ہر جگہ موجود ہیں اور مختلف شکلوں میں اپنا کام کرتے رہتے ہیں یہ بت تم کو خانقاہوں میں، زرکار مسندوں پر بیٹھے ہوئے نظر آئیں گے۔ تعلیمی اداروں میں قرآن کا درس دیتے ہوئے نظر آئیں گے۔ سیاسی جلسوں میں صدارتی تقریریں کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ (ازاں بعد جو کچھ لکھا ہے وہ نقل کفر کفر نباشد کے مصداق بھی درج نہیں کیا جا سکتا خاتمہ یوں

؎ ایضاً ماہ اگست

ہوتا ہے۔) یہ ہیں آج کل کے وہ لات و ہبل۔ جن کو مسمار کرنا ہر انسان کا فرض ہے ،، سلہ

یہی صاحب کعبہ جانے والوں کو اور حجر اسود چومنے والوں کو مشرک اور بت پرست کہہ آئے ہیں ——— اب یہی نیاز صاحب بلا تخصیص ہر مسجد اور خانقاہ کے ملّا اور صوفی کو تہ تیغ کرنے کے خواہاں ہیں۔ اگر ایسے کرم فرماؤں کے خلاف کوئی مُلّا یا صوفی آواز بلند کرتا ہے۔ تو یہ حضرات اسے رجعت پرست، کم علم، کم سواد اور ترقی کا دشمن قرار دیتے ہیں۔

،، میں نجات کا جو مفہوم لیتا ہوں وہ اسی دنیا کے فلاح و ترقی سے متعلق ہے اور وہ یوم آخرۃ یوم میثاق وغیرہ سے متعلق کرتے ہیں، جن کا میں قائل نہیں ہوں۔ اور نہ کوئی عقلی دلیل ان کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے۔ بالخصوص اس وقت تک جب کہ خود کلام مجید سے میرے قول کی تائید ہوتی ہے ،، سلہ

اب اپنی پسند، اپنے گمان، اپنے وہم اور اپنی رائے کے لیے نیاز صاحب کو قرآن سے تائید مل رہی ہے۔ اسی قرآن سے جسے وہ انسانی کلام قرار دیتے ہیں۔

،، قرآن کو خدا کا کلام کہنا یا لوح محفوظ میں اس کا مرتسم ہونا یقین کرنا صحیح اسلامی خیال نہیں ہے۔ بلکہ مستعار ہے۔ یہود و نصاریٰ کا ..... قرآن میں جہاں جہاں کلام اللہ اور کلمات اللہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان سے مراد خدا کے احکام ہیں۔ رسول نے صرف الفاظ پیش کر کے ان کی پوجا نہیں کرائی بلکہ ان کو پیش

سلہ ایضاً صہ ۲۲۲

کرکے ان کی تعمیل چاہی ہے۔ یہ ہے میرا عقیدہ قرآن پاک اور رسول اللہؐ کی رسالت کے متعلق اور میں سمجھتا ہوں کہ رسول کی عظمت کا اقتضا یہی ہے کہ قرآن کو انہیں کا کلام سمجھا جائے۔" ؎۱

قرآن کو کلام الٰہی نہ مان کر بھی نیاز صاحب کو رسول اللہ کی عظمت کا احساس دامن گیر ہے۔ جدید منکرین کے فرمودات میں بھی جہاں کہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا بیان ہوتا ہے۔ ایک دانشمند نیاز صاحب کی آواز کو وہاں سن پاتا ہے۔

"اگر آپ قرآن کا بغور مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ کے تاثرات کے لحاظ سے اس کا اندازِ بیان بھی بدل گیا ہے کہیں تو رسول اللہ نے اپنے نفس سے خطاب کیا ہے۔ کہیں انہوں نے خدا کو مخاطب کر کے اپنے جذبات فدویت و تشکر کا اظہار کیا ہے۔ کسی جگہ اپنے ابناء قوم و اپنے اعزہ و احباب اور اپنے دشمنوں کو مخاطب کیا ہے۔ اور کہیں ایسا انداز اختیار کیا گیا ہے گویا خدا خود کچھ فرما رہا ہے"...." ؎۲

گویا قرآن انسانی تصنیف بھی ہے اور اس کے باوجود اس کا مصنف رسول اللہ بھی ــــ نادانوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کا کتنا آسان طریقہ ہے اور مذہب سے نفور جدید علوم کے پرستاروں کو بہلانے کا کتنا سستا نسخہ ہے۔

ذیل کی سطور میں بظاہر تو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلاح کا عمل نفسیاتی طور پر کیا ہے۔ لیکن در پردہ کعبہ کو بت خانہ ظاہر کرنے

؎۱ ایضاً صفحہ ۲۶ ــ ؎۲ ایضاً صفحہ ۶۰

کی خواہش سے بے تاب ہیں۔ تاکہ اس طرح وہ راستہ ہموار کیا جا سکے۔ جس پہ چل کر آزاد انسان حج وغیرہ کے دھندوں ہی سے نجات پالے۔

"چونکہ نفسیاتی حیثیت سے یہ بات (بت شکنی) ان لوگوں کے لیے سخت اور ردعمل پیدا کرنے والی تھی۔ اور اس کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے کفار و مشرکین کے رجحانات کی کوئی نہ کوئی رعایت ضروری تھی۔ اس لیے ان کے عظیم بتکدہ کی عزت و اہمیت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا۔ اور پرستش گاہ ہونے کی حیثیت سے کعبہ کعبہ ہی بنا رہا۔ ورنہ خدا اور توحید کا جو پاکیزہ و بلند تصور اسلام نے پیش کیا۔ وہ کعبہ وحطیم کو سب سے بے نیاز ہے۔

اس منکر حدیث نے صاف گوئی سے اتنا کام ضرور لیا ہے کہ توحید کو کعبہ سے بے تعلق بتایا ہے۔ لیکن اس کے مروجہ حج کے مفید ہونے کے اقراری ہیں۔ اور اس کے غیر ضروری ہونے کو یوں ظاہر کرتے ہیں کہ حج کی اصل روح اب باقی نہیں رہی۔

"روح و روحانیت کا تعلق بھی میرے نزدیک اسی دنیا سے ہے۔ جو انسان کے اعمال کے لحاظ سے دوزخ بھی بن جاتی ہے اور جنت بھی اور جہاں ہمارے اعمال آئندہ نسلوں کے لیے اچھا یا برا نقش چھوڑ کر ہم کو مرنے کے بعد بھی نہیں مرنے دیتے"

نیاز صاحب فتح پوری کے اس ارشاد کے بعد پاکستان کے ایک منکر حدیث ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب برق کا ارشاد ملاحظہ ہو۔ "موت کے بعد کیا ہوگا۔

لہ ایضاً ص۳۲

کسی کو علم نہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ..... ایک انسان جس پہلو ئے حیات کی تعمیر میں تمام عمر کوشاں رہا ہو موت کے بعد اس کی تکمیل ہو جائے گی ۔ مثلاً اگر ایک شخص عمر بھر تعمیر انسانیت میں مصروف رہا ہو تو مرنے کے بعد اس کی مساعی جامہ تکمیل پہن لیں گی ۔ اور اگر کوئی فرد تخریب انسانیت میں سرگرم رہا ہو تو موت کے بعد اس تخریب کی تکمیل ہو جائے گی"۔ سلہ

نیاز صاحب کے وہ ارشادات جو انہوں نے حدیث سے متعلق درج کتاب فرمائے ہیں وہ ہم دوسرے مقام پر پیش کریں گے ۔ اس وقت ان اقتباسات کے مطالعہ کے بعد ناظرین، پاکستان کے ایک منکر حدیث غلام جیلانی صاحب برق کے فرمودات کو ملاحظہ کرنے کے خواہشمند ہوں گے ۔ لہذا ان کے جواہر پارے ملاحظہ ہوں

برق

غلام جیلانی برق مصنف دو اسلام

؎ برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

دو اسلام کے چند جواہر پارے:-

سلہ دو قرآن صفحہ ۲۷۲

دین کے سب خدمت گار

ـــــــ کون؟ ـــــــ مُلّا!

"وضعی احادیث کا اسلام جس کی تبلیغ پر ہمارے اسی لاکھ ملا، قلم اور پھیپھڑوں کا سارا زور لگا رہے ہیں" ۔ ؎۱

"ہمارے شکم پرست، جاہ طلب اور خود بین سامریوں نے حرم حقیقت میں سینکڑوں بت بنا رکھے ہیں۔ جن میں سب سے بڑا حدیث ہے۔ یہاں حدیث سے مراد وہ اقوال نہیں، جو حضور محترم صلے اللہ علیہ وسلم نے درحقیقت ارشاد فرمائے تھے۔ بلکہ وہ جو ہم نے تراش کر ان کی طرف منسوب کر دیئے تھے۔ اور آج وہ اقوال رسول کے ساتھ یوں خلط ملط ہو چکے ہیں کہ حق کو باطل سے علیحدہ کرنا ناممکن ہو رہا ہے"۔ ؎۲

جب حق کا ملنا (احادیث میں) ناممکن ہے۔ تو پھر سارا دفتر بے کار ٹھہرا۔ اور یہ شکم پرست کون ہوئے۔ پہلی اور دوسری صدی کے صحابہ، تابعین اور آئمہ حدیث۔

"یہ نہ سمجھیے کہ احادیث تراشی کا کام صرف یہود، منافقین اور زنادقہ ہی کیا کرتے تھے۔ بلکہ بڑے بڑے فقہا، وعلما بھی اس بدکاری میں شامل تھے" ؎۳

؎۱ دو اسلام ص۲۱ ؎۲ ایضاً ص۸۰ ؎۳ ایضاً ص۳۶-۳۷

آگے ان کی مختصر فہرست ہے۔

"ہمارے علما عموماً ڈاڑھی کو خضاب لگایا کرتے ہیں۔ خضاب خریدنا اور لگانا کوئی آسان کام نہیں۔ کب کوئی آدمی مرے۔ ملا صاحب جنازے کی فیس وصول کریں۔ اس میں دو آنے بچا کر بازار جائیں اور خضاب لائیں۔ اسے گھولیں۔ لگائیں۔ اور خشک ہونے تک ایک مقام پر بندھے رہیں۔ خضاب لگاتے وقت اتنی منازل طے کرنا پڑتی تھیں۔ اس لیے مولانا نے اس نہایت مشکل کام کا صلہ بھی نہایت موزوں مقرر کیا ہے۔ اللہ کی راہ میں ایک درہم خرچ کرنا سات سو دراہم کے برابر ہے لیکن خضاب پر خرچ کیا ایک درہم سات ہزار کے برابر" ؎۱

"کون ہے جو حسن پرست نہیں لیکن مقیمان مسجد و مکتب میں یہ جذبہ ضرورت سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ مرغن ضیافتیں کھانے کے بعد جنسی میلان بڑھ جاتا ہے۔ اور ہوتے ہیں یہ لوگ عموماً مجرد۔ اور بظاہر پارسا تسکین جنسیت کے وسائل نایاب و کمیاب۔ اس لیے یہ باتوں ہی سے دل خوش کر لیتے ہیں ——— احادیث ذیل انہی دبی ہوئی خواہشات کا نتیجہ ہیں۔

(۱) خوش شکل عورت کی طرف دیکھنے سے نظر بڑھ جاتی ہے (ب) رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں نمکین چہروں اور سیاہ آنکھوں سے محبت کیا کرو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی ملیح چہرے کو آگ کا عذاب نہیں دے گا۔ ؎۲

یہی صاحب اپنی کتاب ایک اسلام میں "ذلیل اور کالے چہرے لعنت ہیں"، کا عنوان قائم کرتے ہیں۔ تو ان کے قلم سے یہ سطور وجود میں آتی

؎۱ ایضاً صفحہ ۱۵۴۔ ؎۲ ایضاً صفحہ ۱۵۵۔

ہیں -

"حضرت فاروقِ اعظم بدصورت کو کبھی کوئی کام نہ دیتے - بلکہ برے نام والوں سے بھی بچتے تھے ۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے - اپنی حاجات حسین چہرے والوں سے مانگا کرو - ہماری نگاہوں سے ہر روز بدصورتی کے کئی نمونے گزرتے ہیں - ایک وہ جو ظالم وجابر ہونے کی وجہ سے ترش رو نظر آتے ہیں - انگریز کے عہد میں اس قسم کے تھانیدار عام ہوا کرتے تھے - کچھ وہ جن کی صورت قمار بازی نے بگاڑ دی ہے" ؎۱

برق صاحب اس وقت چونکہ اپنی بات کی تصدیق کے لیے حدیث سے کام لے رہے ہیں - اس لیے یہ حدیث ان کے نزدیک سچی ہے - ورنہ وہ اسے کسی حسن پرست ملّا کی تراش قرار دیتے ... اور اس پر خوب برستے — اور ان کی افتادِ طبع کے مطابق ان حدیثوں میں بھی نقص نکالنے کی گنجائش نکل آتی -

"ملّا کہتا ہے کہ میری حدیث کا ہر ہر لفظ محفوظ ہے - اسلام رہے یا نہ رہے، حضور کی منزلت زیادہ ہو یا کم - لوگ اسلام پہ ہنسیں یا روئیں میری بلا سے وقت آگیا ہے کہ ہم حدیث کے نیچے دبے ہوئے قرآن کو پھر نکالیں ..... " ؎۲

ارادہ بظاہر نیک ہے - لیکن احادیث سے بے نیاز ہو کر قرآن کی جو تشریح آپ اپنے اقوال سے کرنا چاہتے ہیں - اگر خدانخواستہ اس میں آپ کامیاب ہو گئے تو اسلام کے لیے وہ زمانہ تاریک ترین زمانہ ہوگا -

---

؎۱ ایک اسلام صفحہ ۳۴۶ - ؎۲ دو قرآن ص۱۶۶

چند احادیث کو اپنے زعم میں نہایت فحش سمجھتے ہوئے تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" مجھے یقین ہے کہ یہ احادیث یا تو یہود و نصاریٰ نے وضع کی تھیں اور یا ان شہواتی ملاؤں نے جو ہنڈوں کی طرح عیاشی و شہوت رانی کو جزو مذہب بنانا چاہتے تھے " ۔ لہ

" اگر آپ یہ کہیں کہ بڑھاپے کی وجہ سے حضور تولید کے قابل نہیں رہے تھے۔ تو آپ کے محدثین نے ماریہ قبطیہ (لونڈی) کے بطن سے ابراہیم کیسے پیدا کر دیا تھا۔ لونڈی کے پیٹ سے تو رسول کی اولاد ہو۔ اور نو بیویوں میں سے کوئی حاملہ تک نہ ہو — تعجب — حیرت !! " ۔ ۲ہ

جن احادیث میں اللہ کے ذکر کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ ان میں سے چند کو درج کتاب کر کے اور اسلام میں جہاد کو نہایت اہم عمل قرار دینے کے بعد لکھتے ہیں :-

" دیکھا آپ نے کہ ملاّ نے خطرات جنگ سے بچنے کے لیے کیسی کیسی پناہ گاہیں تعمیر کر رکھی ہیں۔ اگر ان پناہ گاہوں کو گرانے کا نام لو تو وہ شور مچا دیتا ہے کہ وہ دیکھو فلاں شخص بے ایمان ہو گیا ہے۔ احادیث رسول پر حملہ کر رہا ہے۔ اسے سنگسار کرو۔ زندہ جلا دو — ورنہ یہ شخص اسلام کا بیڑہ غرق کر دے گا۔ یعنی اگر آپ سارے قرآن کا ستیاناس کر دیں تو خیر ہے۔ اور ہم آپ کے حصارِ باطل پر حرف ایک آدھ بم پھینک

لہ ایضاً صد ۲۱۴ ۔ ۲ہ ایضاً صد ۲۲۰

بیٹھیں تو آپ پھیپھڑے پھاڑ پھاڑ کر چیخنا شروع کر دیتے ہیں '' سلہ
قطع نظر اس زبان کے جو مصلح صاحب حقیقت کی ترجمانی کے لیے استعمال فرما رہے ہیں۔ ہم بڑی شدت کے ساتھ اس پیرے میں اس نفسیاتی احساس گناہ کو محسوس کرتے ہیں۔ جو منکرین حدیث کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ خط کشیدہ الفاظ پر ایک بار پھر نظر ڈالیے۔ کیا کوئی مصلح ایسا انداز تنقید اختیار کر سکتا ہے۔

''اس وقت پاکستان میں ہزارہا مسلمان پاکستان کی تباہی کے لیے مصروف کار ہیں۔ کوئی خبر رسانی کے فرائض سر انجام دے رہا ہے۔ کوئی ہمارے لیڈروں کو کوس کوس کر ہماری صفوں میں انتشار پیدا کر رہا ہے کوئی شریعت کی آڑ لے کر ہماری جڑیں کاٹ رہا ہے۔ کوئی خلافت الٰہیہ کا راگ الاپ کر مرکز سے دور پھینک رہا ہے۔ کوئی وزراء کی خیالی عیاشیوں کے افسانے تراش کر ہمیں مایوس و شکستہ دل بنا رہا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی اس بری حالت کا ذمہ دار کون ہے۔ اس کا جواب صرف ایک ہے کہ ملّا اور اس کا حدیثی اسلام ...... '' سلہ

۱۹۴۹ء ـــ ۵ کے یہ ہمارے لیڈر جو بڑا گوار تھے۔ ان کے کارناموں کا ذکر خیر کرنا ہمارے موضوع سے تعلق نہیں رکھتا ــــ آج ساری دنیا جانتی ہے کہ پاکستان بننے کے بعد ہمارے لیڈروں نے پاکستان کو کتنا نقصان پہنچایا۔ اور جس مقصد کے لیے یہ مملکت حاصل کی

سلہ ایضاً صـ۲۵۹ ۔ سلہ ایضاً صـ۲۶۶

گئی تھی۔ اس مقصد سے یہ "ہمارے لیڈر" قوم کو کتنے دور لے گئے اس زمانے میں وقت کی حکومت پر جو اعتراض ہوئے تھے۔ اگر وہ غلط بھی تھے۔ تو کیا ان کی ذمہ داری ملاؤں پر اور حدیث پر عاید کرنا انصاف پسندی ہے یا ناانصافی۔ کیا دروغ بافی اصلاح کے لیے ضروری ہوتی ہے؟ ہزارہا مسلمان خبر رسانی کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ کیسے خبریں پہنچاتے تھے۔ انداز بیان سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ ہندوستان کو خبریں پہنچانے کا حضرت صاحب ذکر فرما رہے ہیں۔ آپ کو جب ہزاروں کا علم تھا۔ تو ان ہی سے چند ایک کو پولیس کے حوالے کرنے کی خدمت آپ نے کیوں سرانجام نہ دی کیا اس سے بھی کسی ملّا نے یا کسی حدیث نے آپ کو زبردستی روک رکھا تھا۔

"اس طرح کی احادیث وضع کرنے کا مقصد یہ تھا (یہ مسلم کی احادیث پر تنقید کے بعد لکھا ہے) کہ مسلمان اور قرآن کے درمیان ایک وسیع خلیج حاصل کر دی جائے۔ اسے نااہل، بےکار اور نکما بنا دیا جائے۔ اور ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ دشمن کی یہ چال نہایت کامیاب رہی۔ جس جعلساز نے یہ احادیث تراشی تھیں۔ وہ تو جہنم رسید ہو گیا۔ لیکن اس کے لاکھوں ایجنٹ (ملّا) ہر زمانے میں ہر مقام پر ان احادیث کا دورہ کرتے رہے ہیں اور اپنے وعظوں اور خطبوں میں بلا ناغہ بیان کرتے رہتے ہیں"۔ [1]

---

[1] ایضاً ص ۲۷

منکرِ حدیث نے یہ نہیں سوچا کہ ممکن ہے اس نے ان احادیث کو سمجھنے میں غلطی کی ہو۔ اور یہ وضعی نہ ہوں۔ تو اس صورت میں اس کا یہ انداز تنقید کس درجے کی ستم کیشی قرار پائے گا۔ آپ یہ خیال نہ فرمائیں کہ برق صاحب صرف اس زمانے کے کسی ملا پر برس رہے ہیں۔ اور قرونِ سابقہ کے ممتاز علماء اور فقہا کو انہوں نے بخش رکھا ہے۔ نہیں۔ ایسا خیال کرنا غلط ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔

وہ ہر زمانے اور ہر مقام کے علماء کو جہنمیوں کے شاگرد قرار دے رہے ہیں۔ ہمیں اصلاح کے اس طریق کار سے شدید اختلاف ہے اور ان کے قلم کی بے عنانی پر بہت افسوس ہے۔

مسلمانوں کو بے کار کرنے کے لیے ابلیس جو طریقے اختیار کرتا ہے اور جو داؤ وہ لگاتا ہے۔ ان کا بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"اس طرح کے تمام داؤں وضعی احادیث میں موجود ہیں۔ بڑے ملا نے کہا کہ یہ حدیث وحی ہے۔ چھوٹے نے کہا، امنا وصدقنا۔ اور وہ حدیثی اسلام کی تبلیغ میں نکل پڑا"۔ [1]

بندہ پرور —— وضعی احادیث سے کون بے وقوف سند لیتا ہے۔ آپ کے اس ارشاد میں وضعی کا لفظ محض تکلفاً اور برائے وزن بیت ہے۔ فی الواقع آپ کا نشانہ وہ علماء ہیں جو احادیث کو وحی خفی مانتے ہیں۔ بخاری کی ایک حدیث میں نیک غلاموں کے دگنے اجر کا ذکر ہے۔ اس

---

[1] ایضاً ص۳۳

کو غلط بتلانے کے بعد "ارشاد" ہوتا ہے

"لعنت ایسی زندگی پہ اور پھٹکار اس جعلساز پہ، جس نے یہ حدیث تراش کر اسلام کے بنیادی مقصد پہ اس قدر خوفناک حملہ کیا۔ اور مسلمانوں کو سریر جہانبانی سے اٹھا کر غلامی کے متعفن سنڈاس میں پھینکنے کی کوشش کی۔" لہ

یہی صاحب اپنی تصنیف جہانِ نو میں جب اسی قسم کی ایک حدیث کو اپنے خاص مقصد کے مطابق پاتے ہیں۔ تو اسے صحیح مان کر یوں درج فرماتے ہیں۔
"حضور ہمیشہ یہ دعا کرتے تھے۔ اے اللہ مجھے زندگی میں مسکین رکھ مسکینی میں موت دے۔ اور مسکینوں کے ساتھ میرا حشر کر۔ اس لیے کہ مسکین باقی لوگوں سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔" ص ۵۷

قارئین ملاحظہ فرمائیں۔ کہ کیا اعتراض کی خاطر اس حدیث سے بھی برقی اندازِ فکر کی رو سے وہی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ یہ کسی ملّا نے وضع کی ہے۔ جو مسلمانوں کو غلام بنانا چاہتا تھا

بخاری کی ایک حدیث میں یہ مذکور ہے کہ آنحضرت فرماتے ہیں کہ میں نے جہنم کو دیکھا۔ اس میں مجھے عورتوں کی تعداد زیادہ نظر آئی —— اس پہ برق صاحب بہت خفا ہوئے فرماتے ہیں۔

"اصل بات یہ ہے کہ حدیث تراشوں کی اکثریت ملاؤں پہ مشتمل تھی۔ سست۔ بیکار۔ نااہل۔ نہ کھانے کو روٹی، نہ پہننے کو کپڑا۔ ان کے ازدواجی تعلقات

لہ ایضاً ص ۲۹۶

اکثر ناخوشگوار ہوا کرتے تھے۔ گھر میں سدا دنگہ فساد رہتا تھا۔ اس لیے ملّا نے تنگ آ کر اس طرح کی احادیث تراشنا شروع کر دیں۔ حدیث بالا کے ساتھ ہی یہ ٹکڑا بھی ہے۔ اس لیے کہ عورتیں احسان فراموش و نافرمان ہونے کے علاوہ قرابتوں کا خیال نہیں رکھتیں۔ کسی عورت سے عمر بھر احسان کرو۔ لیکن ذرا سی تکلیف پر وہ سب احسانات بھلا دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ احسان کرنے والے سے مراد یہاں شوہر ہے۔ ورنہ ماں باپ اور بھائی کے احسانات کو کوئی عورت کسی صورت میں بھی نہیں بھولتی۔ عورت کی نافرمانی کی مزید تشریح اس حدیث میں دیکھئے۔ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کو ہم بستری کے لیے بلائے اور وہ انکار کرے۔ اور شوہر ناراض ہو کر لیٹ جائے تو اس عورت پر فرشتے صبح تک لعنت برساتے رہتے ہیں ——— یہ تھا اصل سبب۔ جس کی بنا پر مولانا کو اتنی احادیث گھڑنا پڑیں۔ عورت کے انکار کی کئی معقول وجوہات بھی ہو سکتی ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ حائضہ ہو۔ سر میں درد ہو۔ دن بھر کے کام کاج سے تھکی ہاری ہو۔ میکے سے خط نہ آنے کی وجہ سے پریشان ہو۔ کسی بچے کو کوئی تکلیف ہو۔ اکثر اولاد کی وجہ سے مباشرت کے تصوّر تک سے گریزاں ہو۔ ہمسائی سے جھگڑا ہو گیا ہو۔ شوہر کے منہ سے بدبُو آتی ہو۔ یا اس کی صورت سے متنفر ہو۔ تو کیا ان تمام صورتوں میں عورت ہی مستحق لعنت ٹھہرائی جائے گی۔ اگر شوہر مہینوں نہ نہائے۔ برسوں دانتوں کو صاف نہ کرے۔ گذشتہ جمعرات کا حلوہ داڑھی میں بدستور پھنسا ہوا ہو۔ اس کے کپڑوں سے دماغ کو چکرا دینے والا تعفن اٹھ رہا ہو۔ اس کی

بغلیں سنڈاس سے زیادہ غلیظ ہوں اور عورت اس متعفن مردار کے پاس جانے سے انکار کر دے۔ تو کیا ملعون پھر بھی عورت ہی ہو گی۔ کیا خدا اور اس کے تمام فرشتے شوہر ہی کا ساتھ دیں گے۔ اور اس غلاظت مجسم کو کچھ بھی نہیں کہا جائے گا۔ کیا کہنا اس انصاف کا۔ اور کیا کہنا اس عقل و نظر کا۔ جس نے یہ حدیث ایجاد کی۔"[1]

برق صاحب کی زبان کتنی "دلآویز" اور "حسین" ہے۔ سیدھی سی بات کو انہوں نے کس درجہ الٹ پلٹ کے رکھ دیا ہے۔ اور یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ احادیث دور غلامی کے کسی فرد کی نہیں ہیں کہ ان سے اپنا نیا مجموعہ مرتب کرتے ہوئے شامل کر دی ہوں گی ــــ یہ قرون اولی کی ایک نہایت محترم و باوقار شخصیت کے مجموعہ میں شامل ہیں۔ جس کے تقوی اور خدا پرستی پر دشمن تک گواہ ہیں۔ اگر بقول آپ کے کسی ملا نے ان کو گھڑا اور پھر وہ امام بخاری تک پہنچ گئیں۔ تو اس مفروضے کو اگر سچ ہی ثابت کرنا ہے تو اس کے لیے یہ غیر ثقہ انداز بیان اور بازاری گفتگو، جس سے ذہن کی پراگندگی اور دل کی گندگی کا اظہار ہو رہا ہے۔ اختیار کرنا کس ضابطۂ اخلاق کی رو سے درست ہے۔

خاوند کے بلانے پر اس کے پاس نہ جانے کی معقول وجوہات کی جو فہرست برق صاحب نے پیش کی۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ انہوں نے اس کی ترتیب اور تدوین میں اپنے ماحول کے مشاہدہ سے کام لیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ اس فہرست میں یہ شامل کر لیتے کہ ممکن ہے کہ بیوی کو اپنے بوائے فرینڈ کا خط نہ

---

[1] ایضاً ص ۳۰۸ ــ ۳۱۱

آیا ہو۔" تو اس طرح ان کے اس بیان حقیقت ترجمان کی بدولت بہت سے جدید قسم کے لوگ ان سے خوش ہو جاتے ۔۔۔۔ بندہ نواز! آپ ملّا پر اعتراض کرتے ہوئے صفحہ ۱۵ پر لکھ آئے ہیں کہ ملّا کی یہ تراشش بھی قابل داد ہے کہ "رسول اللہ فرماتے ہیں کہ مسواک سے فصاحت بڑھتی ہے" آپ اس حدیث پر بڑے ناراض ہیں۔ قطع نظر اس ناراضگی سے یا اس امر کے کہ یہ وضعی ہے یا اصلی۔ جو لوگ مسواک سے متعلق احادیث بیان کرتے ہیں۔ وہ ملّا لوگ مسواک ضرور کرتے ہوں گے۔ اپنے شہر کے کسی دندان ساز سے پوچھئے کہ دانتوں سے بُو آنے کی بیماری میں ملّا لوگ زیادہ مبتلا ہوتے ہیں۔ یا وہ لوگ جو مذہب سے بیگانے ہونے میں فخر کرتے ہیں۔ کسی حجام سے پوچھئے کہ اسے اپنی مدت العمر میں کتنے ملاؤں سے واسطہ پڑا ہے جن کی بغلیں سنڈاس جیسی غلیظ ہوتی ہیں اور اس کے مقابلے میں کتنے یورپ نواز روزانہ سنڈاس نما بغلوں کو صاف کرائے بغیر واپس تشریف لے جاتے ہیں۔

برق صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ اس طرح مذہب کے خلاف ایک فضا تو پیدا کی جا سکتی ہے مگر کوئی تعمیری کام اس طرح کی مکروہ تحریروں کے ذریعے سے نہیں ہو سکتا۔

دو اسلام کا تعارف کراتے ہوئے قمر الدین صاحب قمر نے بھی برق صاحب کے اندازِ بیاں کو ناپسند کیا ہے ــــ یہ صاحب اگرچہ اہلِ قرآن ہیں۔ اور حدیث کے خطرناک دشمن۔ (یہ بات اس تعارف سے عیاں ہے) تاہم ان کے نزدیک برق صاحب نے سنجیدگی کو قائم نہیں رکھا۔

لکھتے ہیں :-

" یہ انسانی فطرت ہے جب ہمیں اس قسم کی تلخ گوئی مجسمہ عفو و صفح ..... مسیح علیہ السلام کی زبان سے سننے میں آتی ہے۔ تو ہم دو اسلام کے مصنف سے چشم پوشی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے وقت کے ملاؤں، فقیہوں اور فریسیوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :-

" اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! ایک مرید کرنے کے لیے خشکی اور تری کا دورہ کرتے ہو۔ اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دونا جہنم کا فرزند بناتے ہو ــ اے اندھے راہ بتانے والو! تم پر افسوس ــ اے احمقو اور اندھو! ــ ظاہر میں تو لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو ــ اے سانپو! ــ اے افعی کے بچو! ــ تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچو گے " ؎ ۱

اگر قمر صاحب کو اس غیر سنجیدہ زبان پر فی الواقع افسوس ہوتا تو وہ اس مصنف کو اس طرح کی سطور کو کتاب سے خارج کر دینے کا مشورہ دے سکتے تھے۔ ان کے رسالہ البیان نے برق صاحب کی بڑی خدمت کی ہے اور ان کی پوری پوری تصانیف کو اپنے اوراق میں جگہ دی ہے۔ برق صاحب ان کے مخلصانہ مشورے پر ضرور عمل کرتے ــــ مگر ہمیں سخت افسوس ہے کہ یہ الفاظ قمر صاحب کے دل کی آواز ہیں وہ یہ تعارف اس لیے تحریر فرما رہے ہیں کہ برق کی مخالفت میں اس طرح کچھ نہ کچھ کمی ضرور واقع ہو جائے

؎ ۱ ایضاً ص ۳۳

گی - ان کی تحریر کا ایک حصہ ملاحظہ کیجئے :-

" اقبال نے کہا تھا -

صد جہان باقی است در قرآن ہنوز
اندر آیاتش یکے خود را بسوز

برق صاحب نے اس صد جہان کے سراغ کی راہ نکالی - اب آنے والی نسلیں اس کو ڈھونڈیں گی اور پائیں گی - اس کی زیر نظر تصنیف پاکستان اور آئین پاکستان کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات کے حل کی طرف ایک موثر قدم ہے - میں پھر کہتا ہوں کہ یہ ایک بم ہے ایٹم بم - ان تمام مصنوعی مذاہب کے لیے جو دو اسلام کے نام سے مسلمانوں کے اندر آتش فتنہ و تفریق بھڑکائے ہوئے ہیں " لے

قمر صاحب کو دو اسلام اس لیے پسند ہے کہ یہ تصنیف پاکستان کے آئین کے راستے میں آنے والی رکاوٹوں کو دور کرے گی — یہ رکاوٹیں کیا ہیں - فقط یہ کہ پاکستان کے باشندے قانون سازی میں قرآن کے ساتھ سنت کو بھی شامل کرنا چاہتے ہیں - اور جب یہ تصنیف (ان کے خیال میں) سنت کو برباد کر دے گی تو پھر قرآن کی طرف راہ کھلے گی —— اے کاش! — اس خواہش کے پیچھے خلوص اور اسلام کی ہمدردی ہوتی — یہ سب باتیں اسلام کا جدید یورپی ایڈیشن مرتب کرنے کے لیے راہ ہموار کرنے کی تیاریاں ہیں -

اس حملے کا پہلا وار ان علماء پر ہے - جنہوں نے حدیث اور فقہ کی

لے ایضاً ص ۳۱

کی خدمت کی ہے۔ وہ قرونِ اولیٰ کے ہوں۔ یا بیسویں صدی کے۔ ان کو یک قلم بدنام کرنا۔ ملائے مکتبی، رجعت پسند، اور شہوت پرست کے القابات سے نوازنا، ان مصلحین کا ایک دلچسپ مشغلہ بھی ہے اور ان کے پروگرام کا ایک حصّہ بھی۔

"قرآن کا ہر حکم فرض ہے یہ ملّا کی مکاری ہے کہ وہ پانچ آسان آسان احکام کی محض ظاہری صورت کو تو فرض سمجھتا ہے۔ اور باقی تمام قرآن کے احکام پر عمل کرنے کو یا تو مستحب قرار دیتا ہے اور یا چھپا جاتا ہے... ... کیا قرآن میں سات سو چھپن آیات مطالعہ کائنات کے متعلق موجود نہیں —— تو پھر تمہارے وعظوں اور خطبوں میں ان آیات کا کیوں ذکر نہیں آتا۔" ؎۱

مطالعہ کائنات کی یہ راگنی اس مقصد کے لیے سمع نوازی نہیں کر رہی کہ احادیث مطالعہ کائنات کے خلاف ہیں۔ بلکہ جدید...... علوم و فنون نے یورپ اور امریکہ کو معاشی میدانوں میں جو سر بلندی بخشی ہے۔ اس کی اہمیت بتاتی ہے تاکہ اس کے بعد جب مسلمانوں کی غربت کا نقشہ کھنچ جائے تو مذہبِ اسلام کو اس افلاس کا ذمّہ دار بنایا جا سکے —— اسی غرض کے لیے وہ یورپ کے فلاسفہ و حکماء کو یقیناً ناجی سمجھتے ہیں۔ اور مادی ترقیوں سے بے نصیب مذہب پرستوں کا استہزا کرتے ہیں۔

یورپ کے سائنسدانوں کے کمالات کا ذکر کرتے کرتے ارشاد

؎۱ دو قرآن ص ۳۵

ہوتا ہے :۔

"جن کے دل الوہیت کے نشیمن بن گئے۔ یہ معتوب، مغضوب اور سوختنی و کشتنی ہیں اور تم اسے ہمارے ملّاؤ! ۔ جن کی نگاہیں تجلّیات فطرت سے بے نصیب۔ جن کے کان حجر و شجر کے زمزموں سے محروم اور جن کے دل فہم و ادراک سے کوسوں دور ہیں ۔ اللہ کے محبوب اور جنت کے مستحق!" [۱]

آپ صفحہ پر برق صاحب کے نظریہ جنت و دوزخ کو پڑھ آئے ہیں ۔ اب یہ فیصلہ با آسانی ہو سکتا ہے کہ جنت کے اس استحقاق کا مسخر کس مقصد کے لیے ہے ۔ اصلاح پسند طبیعت اس نہج پر عمل پیرا ہونے کی کسی سلیم فطرت والے انسان کو اجازت نہیں دے سکتی۔ جس روش پہ برق صاحب، اور ان کے رفقاء کار گامزن ہیں۔ ہمارے ملّاؤ کا اختصاص اس لیے ہے کہ برق صاحب نے علّامہ اقبال کے خطبات میں حکمائے اسلام کی تحقیقات کا مطالعہ کیا ہے۔ اور دنیا جانتی ہے کہ مسلمان حکمائے حقائق جاننے کے لیے بڑی کاوش اور جد و جہد کی ہے۔ اگر "ہمارے" کا لفظ نہ ملاتے تو ان کی زد اعلانیہ تمام حکمائے اسلام پر ہوتی۔ اور ان کا مقصد ادھورا رہ جاتا۔

وسعت افلاک سے متعلق یورپ کے داناؤں کی نگارشات کی خوشہ چینی کے بعد لکھتے ہیں :۔

---

[۱] دو قرآن صد ۵۳

"ادھر انسان کو دیکھو کہ ان دنیاؤں کے مقابلے میں اس کی ہستی ایک حقیر کیڑے سے زیادہ نہیں۔ نافرمانی و بدعملی میں چوٹی تک ڈوبا ہوا ہے۔ اور پھر خدا کا پیارا اور لاڈلا ہونے کا گھمنڈ ہے۔ در بدر مانگتا پھرتا ہے۔ لیکن جنت کا ٹھیکیدار ہونے کا پندار ہے چیتھڑے اور جوئیں سنبھال نہیں سکتا۔ لیکن امتِ رسول ہونے کا غرور ہے۔ مسکنت اور ذلت کا مجسمہ بن چکا ہے لیکن تقدس و پاک بازی کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس بر خود غلط انسان کو کیا معلوم کہ اس صاحب جبروت رب کے ہاں جس کی فضاؤں میں زمین جیسی ارب کھرب دنیائیں نہایت شکوہ و عظمت سے گھوم رہی ہیں۔ انسان کو کوئی وقعت حاصل نہیں" [1]

قطع نظر اس سے کہ یہاں انسان سے مراد مسلمان ہے۔ اور وہ بھی غریب و نادار مسلمان جسے برق صاحب نہایت حقیر سمجھتے ہیں۔ یہ خیال نہایت گمراہ کن اور غلط ہے۔ انسان کی عظمت کے جتنے گیت ان کے پیر و مرشد [2] حضرت علامہ اقبال نے گائے ہیں۔ اس دور کے کسی شاعر اور فلسفی کے ہاں ان کا عشر عشیر بھی موجود نہیں ہے

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

یہ دنیائیں تو موجود تھیں۔ مگر انسان نہیں تھا۔

---

[1] دو قرآن ص ۱۱۹

[2] ۔ علامہ اقبال کو پیر و مرشد ہم بھی مانتے ہیں۔ مگر برق صاحب انہیں خاص طور پر یاد فرمایا کرتے ہیں۔

ع ہیں آدمی کے دم سے خدائی کے کھیل یاں
بازی کہاں بساط پہ گر شاہ ہی نہیں (درد)

اقبال کے سارے کلام کو پڑھ جائیے۔ آپ کو کہیں خلیفۃ اللہ فی الارض یعنی حضرت آدمؑ کی توہین کے کلمات نہیں ملیں گے۔

لیکن برق صاحب ہیں۔ کہ یہ مسلمان کو ذلیل ترین مخلوق بتا رہے ہیں۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ انہوں نے یورپ کے حکماء کی کتابوں کے بکثرت اوراق کا ترجمہ اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ اور کائنات کے مطالعہ کی طرف ان اوراق کے پڑھنے سے رغبت پیدا ہوتی ہے۔ مگر یہ انداز تبلیغ نہایت گھناونا ہے جو انہوں نے اختیار کر رکھا ہے۔

صفائی سے متعلق اچھی اچھی باتیں لکھنے کے بعد فرماتے ہیں :۔

”گرمی کے ایام میں مسجدوں[ا] میں چند ایسے نمازی جمع ہو جاتے ہیں۔ جن کے کپڑوں سے سخت بدبو آیا کرتی ہے۔ لیکن مولوی صاحب انہیں کچھ نہیں کہتے۔ اس لیے کہ حضرت مولانا کے ہاں والرجز فاھجر کا حکم بالکل غیر ضروری سا ہے۔ سردی میں کشمیری تو اپنی ”نفیس“ پوشاکوں کے ساتھ گل کدہ کشمیر سے تشریف لاتے ہیں۔ کس حسین سرزمین سے آتے ہیں اور لباس کس قدر غلیظ ہوتا ہے۔ اس حسین خطے میں یہ بد مذاق انسان واللہ قدرت کی بہت بڑی ستم ظریفی ہے۔“

ا۔ نیاز صاحب مسجدوں کے اجتماع کو جانوروں کا مجمع کہتے ہیں۔

اس پر مدیر البیان نے حاشیہ میں لکھا ہے ۔ مشہور ہے کشمیر بہشت است و لے از دوزخیاں آباد است ۔ [1]

کیا اسی طرح کی گفتگو سے "غیر صاف" لوگ صفائی کو اختیار کریں گے کیا اصلاح پسندوں کا یہی شیوہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو استعمار پسندوں نے تباہ کر دیا ہو۔ جنہیں روٹی اور کپڑے کے الجھاؤں سے نکلنے کی کوئی راہ ہی سجھائی نہ دے رہی ہو۔ انہیں دوزخی مان لینے سے اصلاح ہو جاتی ہے ۔ یہ حاشیہ کسی ظریف کا ہوتا تو نظر انداز کرنے کے قابل تھا۔ مگر مدیر البیان تو بہت بڑے "اہل قرآن" ہیں۔ وہ ایسا لب و لہجہ کس لیے اختیار فرما رہے ہیں۔ بندہ پرور جب کوئی قوم معاشی ، اقتصادی اور سیاسی طور پر تباہ کر دی جاتی ہے۔ تو اس کے جملہ حسین و جمیل اوصاف بھی تباہ ہو جایا کرتے ہیں کسی ملّا کے کہنے سے کشمیری " تو " گندے لباس کو اختیار نہیں کرتے ۔

ناظرین ان اقتباسات سے اکتا گئے ہوں گے ۔ ہم صرف ایک حوالے کے بعد اس مکروہ نقل نویسی کو ختم کرتے ہیں

ارشاد ہوتا ہے :۔

"اگر ہم اپنے ملّا کا مذہب قبول کر لیں تو پھر استنجا بھی اصول دین منڈا ہوا سر بھی رکن اسلام ۔ ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی شلوار بھی مذہبی فرض ۔ منڈی ہوئی موچھیں اور لمبی ڈاڑھی بھی جزو دین ، مسلمان کیا ہوا ، ایک

---

[1] دو قرآن صد ۱۲۵

اچھا خاصہ جوکر بن کر رہ گیا۔ کیا آپ ان لایعنی قیود میں جکڑا ہوا اسلام کسی انگریز کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کسی نومسلم انگریز کا سر مونڈ کر اوپر ایک موٹا سا پگڑ باندھ دیں۔ موچھیں مونڈ ڈالیں۔ ڈاڑھی ناف تک بڑھا دیں۔ نیچے ٹخنوں سے بالشت بھر اونچی شلوار پہنا دیں۔ پگڑ میں مسواک ٹانگ کر ساتھ تسبیح باندھ دیں۔ اور آنکھوں میں سرمہ ڈال کر اسے انگلستان بھیج دیں۔ تو وہ ہی نتیجے ہوں گے۔ یا تو انگریز اسے جن سمجھ کر مار ڈالیں گے اور یا پھر چڑیا گھر میں بند کر دیں گے"۔ ؎۱

برق صاحب! استنجا غلاظت کو (اسے منجمد کیے بغیر) دور کرنے کے لیے ہے۔ منڈا ہوا سر دماغ کی درستی کا اعلان ہے۔ اونچی شلوار راستے میں بڑی ہوئی گندگی سے پائنچوں کو بچانے کے لیے ہے۔ مسواک دانت صاف کرنے کے لیے ہے۔ تسبیح اسمائے الٰہی پڑھتے وقت معمول کا حساب درست رکھنے کے لیے ہے۔ سرمہ گرد و غبار کو آنکھوں سے دور کرنے کے لیے ہے۔

فرمایئے —— آپ کو کیا اعتراض ہے۔ ان کے استعمال اور وجود سے اسلام کو کیا نقصان پہنچتا ہے۔ رہا یہ اعتراض کہ انہیں ارکانِ اسلام بنایا گیا ہے۔ تو اس کی کوئی دلیل آپ قطعاً نہیں پیش کر سکتے۔ کس مولوی یا ملّا نے انہیں ارکان بنایا ہے۔ اور کس کتاب میں۔ اسلام کے کس فقیہ، مفتی، یا قاضی نے ان کو جزو دین ہونے کا فتویٰ دیا ہے؟

؎۱ دو اسلام صفحہ ۱۱۴

ہمیں سخت افسوس ہے کہ یورپ کے یہ پرستار اعتراض کرتے وقت الزام تراشی کو اپنا مسجود بنا لیتے ہیں اور تمسخر کو اپنا قبلہ سمجھ کر دنیا کے سامنے اپنی "ماڈرن ازم" کو فخریہ پیش کرتے ہیں۔

برق صاحب انگریز کے سامنے اسلام کو یوں نہ پیش کیجئے گا۔ بلکہ اسے کوٹ پتلون پہنا کر، ہیٹ سے سرفراز کر کے لے جائیے گا۔ وہ اسے اپنے گھر کا مال سمجھ کر لبیک کہے گا ___ جن انگریزوں کو اس ہیئت کے مسلمانوں سے میدانِ جنگ میں ورسطر پڑا ہے ذرا ان سے دریافت فرمایا ہوتا کہ وزیرستان، کوہاٹ، بنوں، اور درہ خیبر کے اس پار کس قسم کے مسلمانوں نے ان کے دانت کھٹے کیے تھے۔ ان ڈاڑھی والوں کے تصوّر سے آج تک ان انگریزوں کے دل کانپتے ہیں۔ کیا سلطان صلاح الدّین ایوبیؒ کی افواج میں جو مجاہد شامل تھے۔ ان سب کی ڈاڑھیاں صفا چٹ تھیں؟ کیا ان کے سروں پر ہیٹ تھے؟

بندہ پرور! جو مسلمان ان باتوں کو پسند کرتے ہیں ___ آپ کون ہوتے ہیں ___ ان کو حقیر سمجھنے والے! ۔ آپ کے پیر و مرشد کا فتویٰ تو یہ ہے۔ ع

مانع علم و ہنر عمامہ نیست (اقبالؒ)

جب ان چیزوں کو کوئی جزو مذہب نہیں سمجھتا تو آپ کو اس تضحیک سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ آپ کا اپنا کہنا ہے کہ دشنام آلود لٹریچر کو کون پڑھے۔ اور مغلظات کون سنے۔ میٹھے انداز اور ہمدردانہ رنگ میں کہی

ہوئی بات پر ہر شخص غور کر سکتا ہے۔ لیکن گالیاں کوئی نہیں سنتا،،[1]

برق صاحب کے ہاں دوسرے منکرین حدیث کی طرح تضاد بھی فراواں ہے۔ جو لوگ متضاد باتیں کرتے ہیں۔ انہیں ہمیشہ مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی کسی بات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا خاص کر جب ایسے افراد مصلح وقت اور دین کے شارح ہونے کے دعویدار ہوں۔ ان کے ہاں ہر تضاد بیانی ~~مصعد~~ الزام ٹھہرتی ہے۔ ہم ناظرین کی توجہ کے لیے منکرین حدیث کے لٹریچر سے چند متضاد باتیں پلیش کرتے ہیں۔ اس سے بآسانی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ ان بزرگوار وں کا پروگرام امت میں انتشار پیدا کرنا ہے یا فرقہ بندیوں کو توڑنا ہے۔

ایک قوم کے ننگ و ناموس کی حفاظت اس کے نوجوان کیا کرتے ہیں اس وقت تک جو سلوک یورپ نے اپنے نوجوانوں سے کیا وہ انتہا افسوسناک ہے۔ یہ زنانہ سوٹ، یہ مونثانہ ادائیں، یہ عیش پرستی، یہ خورد و نوش، یہ عشق بازی، یہ دن میں پانچ مرتبہ تنور شکم تپانا، یہ ٹینس، یہ برج، یہ مخلوط تعلیم اور یہ مخلوط کلب۔ نوجوانوں کے لیے پیام موت بن گئے۔ ...... جوانوں کی اس رنگین مزاجی کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ اقوام دنوں اور ہفتوں میں مٹ گئیں۔....،،[2]

برق صاحب اس وقت جفاکشی کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔ لہذا انہوں نے مخلوط تعلیم وغیرہ کو جفاکشی اور جہاد زندگی کے منافی سمجھا۔ اور

---

[1] حرف محرمانہ صـ ۱۲ - [2] دو قرآن صـ ۲۰۶

درست سمجھا۔ ہم اس معاملے میں ان کے پوری طرح ہم نوا ہیں۔ لیکن جب پاکستان میں مخلوط تعلیم کا سوال پیدا ہوتا ہے تو آپ اس نظریے کو نظر انداز کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

" آج عورت مرد کے سامنے بے بس ہے۔ اور اس کی کئی وجوہات ہیں اول رواج اور دیرینہ روایات، دوم عورتوں کی ہمہ گیر بے عملی۔ سوم عورتوں کی خاموشی۔ اور ان تمام دکھوں کا واحد علاج عورتوں کو تعلیم دلانا ہے۔ تعلیم کردار کو بلند، شخصیت کو باثر اور زبان کو فصیح بنا دیتی ہے۔ علم سے تصورات حیات بدل جاتے ہیں بالیدگی، ایمان میں تازگی۔ دل میں حرارت اور جذبات عالیہ میں حرکت پیدا کرتا ہے۔ ہمارا یہ فرض ہے کہ اپنی بچیوں کو بلند تعلیم دلوائیں۔ اگر کسی شہر میں لڑکیوں کا کالج موجود نہ ہو۔ تو لڑکوں کے کالج میں انہیں بھیجیں۔ میں مانتا ہوں کہ لڑکوں کے ہمراہ بیٹھ کر پڑھنے میں کچھ خطرات بھی ہیں۔ لیکن فوائد بہت زیادہ ہیں۔ اللہ نے شراب و قمار کو حرام کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ کہ ان کا نقصان فائدے سے زیادہ ہے اور اس لیے انہیں حرام کر دیا گیا تھا۔ دوسری طرف اگر لڑکیاں لڑکوں کے ہمراہ مل کر پڑھیں تو فوائد نقصانات سے بہت زیادہ ہیں۔ اس لیے یہ اقدام جائز ہوگا۔" [1]

ہم سر دست اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ کالج کی تعلیم روح میں بالیدگی پیدا کرتی ہو یا روح کا صفایا کر دیتی ہے۔ اس کی بدولت ایمان میں

---

[1] جہان نو صفحہ ۱۹۰-۱۹۱

تازگی آتی ہے یا ایمان کا جنازہ نکل جاتا ہے جذباتِ عالیہ میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ یا جذبات فاسدہ پروان چڑھتے ہیں۔ ان باتوں کو کالج میں پڑھنے والے اور پڑھانے والے خوب جانتے ہیں۔ مخلوط تعلیم کے فوائد زیادہ ہوں یا کم۔ یہ بات بھی غور طلب نہیں ہے۔ بلکہ سب سے زیادہ ہماری توجہ کی حقدار۔ ذیل کی باتیں ہیں، ۱ دیرینہ روایات۔ یہ روایات مشرق میں مذہب کی بدولت زندہ رہتی ہیں۔ گویا مذہبی روایات برق صاحب کے نزدیک عورت کو مبتلائے عذاب رکھ رہی ہیں۔

۲۔ عورت کی خاموشی۔ ان تین لفظوں کے اندر عورت کے لیے جو پیغام ہے۔ اسے صرف نفسیات کے ماہرین ہی نہیں سمجھتے بلکہ روسی پروپیگنڈے کے سرسری واقف کار بھی ان کی قدر و قیمت جان سکتے ہیں۔

اس سے بڑھ کر دلچسپ بات اس مخلوط تعلیم کو جائز قرار دینے کے لیے قرآن کا موجودہ حوالہ ہے۔ شراب اور جوئے کو ان کے نقصانات کی وجہ سے حرام کیا گیا ہے ــــ برق صاحب اس آیت کو کسی بات کی حرمت کے لیے پیش کرتے تو استدلال درست ہوتا۔ انہوں نے اسے الٹ کر ایک امر کے جائز ہونے کے لیے پیش فرمایا ہے۔ یہ طرز استدلال محل نظر آتا ہے۔ فرض کیجئے کسی زمانے میں کسی ایک فرد کے لیے۔ یا چند افراد کے ایک گروہ کے لیے ملک فروشی یا ملت سے غداری کرنے میں نقصانات کم ہوں اور فواید زیادہ ہوں تو کیا اس کے اس قبیح فعل کو جائز قرار دینے کے لیے اس آیت سے استدلال کرنا

درست ہوگا۔ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا۔

جب آپ کے نزدیک مخلوط تعلیم قوائے عمل کو شل کر دیتی ہے۔ قوم کے جوان جد وجہد کے قابل نہیں رہتے۔ تو پھر احسن اور فائدہ مند کیسے قرار دیا جائے گا۔

اس دور کے منکرین حدیث کو ان کمزوریوں کا علم اچھی طرح ہے۔ ان کے پیشرؤوں کو جن سوالات نے ہر میدان میں شکستیں دی تھیں ان کے جواب دینے کے نئے طریقے...... کیے گئے ہیں۔ ہم ان پہ ذرا تفصیل کے ساتھ نظر ڈالیں گے۔ انہیں ان کی اپنی زبانی ہی سنئے۔

برق صاحب لکھتے ہیں :۔

" ہمارے بعض بزرگ کہتے ہیں کہ احادیث کو چھوڑ دو گے۔ تو نماز پڑھنے کا طریقہ کہاں سے سیکھو گے۔ اور زکوٰۃ کی مقدار کہاں سے متعین کرو گے ؟ ۔۔ " ۔۔

اب برق صاحب زکوٰۃ کے مسئلے کو حل فرماتے ہیں۔

" باقی رہا زکوٰۃ کا مسئلہ تو اسے خود قرآن نے بھی واضح کر دیا ہے۔ زکوٰۃ ہے کیا چیز ؟ ۔ اللہ کے راستے میں مالی قربانی۔ ہمارے فقہا کہتے ہیں کہ ادائے زکوۃ کے لیے ایک وقت (ماہ رجب) اور مقدار (اڑھائی فی صدی) معین ہے۔ لیکن اللہ کے ہاں اس کا وقت متعین کوئی نہیں۔ البتہ مقدار کا تعین ضرور ہے۔ اللہ نے مسلمانوں کی تعریف یہ بیان کی ہے " اللہ نے مسلمانوں سے دو چیزیں لے لی ہیں۔ جان اور مال۔ اور اس کے صلے میں انہیں جنت

دے دی ہے ـــ یعنی ہماری جان اور مال کا مالک اللہ ہے۔ جس طرح جان سپاری کا کوئی خاص وقت متعین (نہیں) ہے جس وقت جنگ کا بگل بجا۔ مسلمان سربکف حاضر۔ اسیطرح مال سپاری کا بھی کوئی خاص وقت نہیں۔ جب بھی ملت پہ ابتلا کا وقت آیا۔ مسلمانوں نے سب کچھ خدا اور رسول کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ہمارا ملّا اس طرح کے مالی ایثار کو صدقہ یا انفاق کہتا ہے۔ اور اصطلاحی بحثوں میں الجھ پڑتا ہے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے۔ کہ زکوٰۃ کے معنی ہیں ـــ پاکیزگی۔ چونکہ اللہ کی راہ میں مالی ایثار منفق اور مال دونوں کو پاکیزہ بنا دیتا ہے۔ اس لیے لاَمحالہ ہر قسم کی مالی قربانی زکوٰۃ سمجھی جائے گی۔ اگر میری بات پہ یقین نہ آئے۔ تو یہ لیجئے اللہ کا فیصلہ ـــ

خذ من اموالہم صدقۃ تطہرہم بہا
و تزکیہم۔

مسلمانوں سے صدقہ لے کر انہیں مطہّر اور مزکّی (پاک) بنا دو۔ تزکّی کا ماخذ زکوٰۃ ہے۔ تو گویا اللہ کے ہاں ہر قسم کی مالی قربانی زکوٰۃ شمار ہوتی ہے"۔ [1]

اس کے بعد اشتراکیت اور سرمایہ کا خدائی حل یوں بیان فرماتے ہیں:۔

"سنو اللہ کا اٹل اور اٹل فیصلہ:۔

یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو۔

---

[1] دو اسلام صد ۱۲۴ ـــ ۱۲۶ ـ

لوگ تم سے پوچھتے ہیں — کہ مالی قربانی کی حد کیا ہے؟ انہیں کہہ دو کہ ہر فالتو اور زاید از ضرورت چیز خدا اور رسول کے سامنے پیش کر دو"۔ ؎۱

اگر کسی غیر جانبدار منصف کو حدیث کے منکرین اور مصدقین کے مابین اس امر کا فیصلہ کرنا ہو۔ کہ حق پر کون ہے۔ تو اس کے لیے زکوٰۃ کی محوالہ بالا بحث اور اس سے متعلق ضروری باتوں کا مطالعہ کافی ہو سکتا ہے۔ لہذا ہم اس بحث کو تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے۔

اگر برق صاحب کا اس بات پر ایمان ہوتا — کہ اسلام کی رو سے ہر فالتو چیز خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دینی چاہیئے۔ تو ان کے قلم سے ذیل کی عبارت وجود میں کبھی نہ آسکتی

"مجھے بنک کا کوئی پہلو مضر نظر نہیں آتا۔ بلکہ بنک کے مندرجہ ذیل فوائد ہیں۔

اول۔ اگر رقم ہاتھ میں ہو تو جلدی ختم ہو جاتی ہے۔ بنک میں چلی جائے تو بغیر سخت احتیاج کے کوئی نہیں نکلواتا۔ دوم۔ بنک کے قواعد بھی کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ کوئی شخص ہفتے میں ۵۰۰ روپے سے زائد نہیں نکلوا سکتا۔ اس لیے مجبوراً کفایت شعار بننا پڑتا ہے — سوم۔ رقم گھر میں ہو تو ہر وقت چور کا خطرہ رہتا ہے۔ بنک میں چلی جائے تو ذہنی بے چینی سے نجات ہو جاتی ہے۔ چہارم۔ آج کل کی

؎۱ ایضاً ص ۱۲۶۔

تجارت بنکوں کی وساطت سے ہوتی ہے۔ (اور اس میں آسانی ہے)۔ موجودہ زمانے میں بنک ہماری اقتصادی عمارت کا سب سے بڑا ستون ہے۔ اگر یہ نہ ہو۔ تو داخلی وخارجی تجارت ناممکن ہو جائے۔ انصافاً کہیے کہ ایسی مفید اور ضروری چیز کو اللہ کیسے حرام قرار دے سکتا ہے۔ ؎۱

ان فواید کی شق دوم نہایت غور طلب ہے۔ یہ خدائی تصرف کے زیر اثر برق صاحب کے نکل گئی ہے۔ بنک کے قواعد کی رو سے اس جمع شدہ مال (deposit) کے نکلوانے پر اس طرح کی پابندی ہوتی ہے جو Current account پر نہیں ہوتی عموماً وہی سرمایہ دار بنک میں ایسا حساب کھلوایا کرتے ہیں۔ جنہیں سرمایے کی ضرورت کبھی کبھی پیش آتی ہو۔ اس طرح کے جمع کردہ مال پر بنک سود دیتا ہے۔ اور (کرنٹ اکاؤنٹ) والے کو سود نہیں دیتا۔ بلکہ اس سے کچھ رقم حقِ خدمت کے طور پر لیتا ہے۔

برق صاحب کے ذہن میں سود طلب سرمایہ کو بنک میں جمع کرنے کا خیال اتنی شدت میں موجود تھا کہ انہوں نے کفایت شعاری کی ایک ترکیب کو درست بتاتے وقت اس بات کا خیال نہیں رکھا۔ کہ جو شخص اس قسم کا پابند حساب بنک میں رکھتا ہو۔ وہ ان کے نظریہ کی رو سے۔ اسلام اور قرآن کے خلاف عمل کرتا ہے۔ یعنی فالتو ادرہ زائد از ضرورت مال کو اللہ کے نام پر دینے کے بجائے۔ بنک کو دے رہا ہے۔ اور پھر

؎۱۔ جہان نو ص ۱۴۲ — ۱۴۳۔

اس عطیہ پر سود کا بھی طلب گار ہے۔ شاید آپ بنک کو بیت المال سمجھتے ہوں گے اگر آپ بنک کو بیت المال قرار دیتے ہیں۔ تو اس صورت میں یہ اعتراض تو باقی رہ ہی جاتا ہے۔ کہ بیت المال سے سود لینا کس نبی کے حکم سے جائز اور قرآن کی کس آیت سے ثابت ہے۔؟۔

حضرات! بات صرف اتنی ہے کہ ان کرم فرماؤں کا ایمان ہی متزلزل ہوتا ہے۔ ایمان ویقین کی دولت والے اس قسم کے خیالات کا اظہار نہیں کیا کرتے۔

"موت کے بعد کیا ہوگا۔ کسی کو علم نہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے۔ کہ ایک انسان جس پہلوئے حیات کی تعمیر میں تمام عمر کوشاں رہا ہو۔ موت کے بعد اس کی تکمیل ہو جائے گی۔ مثلاً اگر ایک شخص عمر بھر تعمیر انسانیت میں مصروف رہا ہو۔ تو مرنے کے بعد اس کی مساعی جامہ تکمیل پہن لیں گی۔ اور اگر کوئی فرد تخریب انسانیت میں سرگرم رہا تو موت کے بعد اس تخریب کی تکمیل ہو جائے گی۔" [1]

ہم تو اس تخریب کی تکمیل اور تعمیر کی تکمیل کو نہیں سمجھ سکے۔ کوئی منکر حدیث اپنی "خدا داد فہم" اور "بصیرت" کو کام میں لا کر اس عبارت کا مفہوم واضح کر دے تو ہم اس کے ممنون ہوں گے۔ تاہم اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ اس عبارت سے برق صاحب کی وہ بے یقینی مترشح ہو رہی ہے۔ جو انہیں آخرت سے متعلق محیط ہے۔

رہا یہ سوال کہ زکوۃ سے متعلق برق صاحب کا یہ ارشاد کہ "اللہ کے ہاں

---

[1] دو قرآن ص ۲۷۲

اس کا وقت تو معین نہیں "۔ یہ بالکل ویسی ہی بات ہے جیسے بعض ٹانگہ والے جب کسی سواری سے واجبی کرایہ سے زیادہ لینے کے خواہشمند ہوں۔ تو وہ عموماً کہا کرتے ہیں۔ جو جی میں آیا دے دینا۔ جن لوگوں کو اس عدم یقین کا تلخ تجربہ ہو گا وہ برق صاحب کے اس عدم تعین کے نقص کو بھی سمجھ جائیں گے۔ انہوں نے اس خیال کو یوں بیان فرمایا ہے کہ "جس طرح جان سپاری کا کوئی خاص وقت معین نہیں ہے۔ اسی طرح مال سپاری کا بھی کوئی خاص وقت نہیں" یہ جذباتی اندازِ بیان تو ہو سکتا ہے۔ مگر اسے حقائق کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ جان سپاری کا واقعی کوئی وقت معین نہیں ہو سکتا۔ جب مطالبہ ہو گا۔ کوئی "جاندار" جان کے عدم وجود کا کیسے اعلان و اظہار کر سکے گا۔ اس کے برعکس مال سپاری کا وقت معین نہ ہو۔ تو اس سے مال کا وصول ہونا ممکن نہیں رہتا۔ مال ضائع ہو سکتا ہے، خرچ ہو سکتا ہے، یا ہوتے ہوئے ..... بھی اس کے نہ ہونے کا بہانہ بنایا جا سکتا ہے۔ جن قرض داروں کے ہاں "دے دیں گے" کا فقرہ عمل میں آتا ہو۔ وہ کبھی قرض ادا نہیں کیا کرتے۔

اوپر یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ "اللہ کے ہاں وقت تو معین کوئی نہیں۔ البتہ مقدار کا تعین ضرور ہے"۔ [1]

اس کا بیان برق صاحب نے آئندہ صفحات میں کہیں نہیں فرمایا۔ اس کے بعد جو آیت درج کر کے اس کی جو تشریح کی گئی ہے۔ اس میں بھی کسی

---

[1] دو اسلام ص ۱۲۶

مقدار کا بیان نہیں ہوا - معلوم نہیں ان کی کتاب اللغات میں مقدار سے کیا مراد ہے ؟ - بہرحال اس کتاب میں تو انہوں نے اس مراد کو ظاہر نہیں فرمایا -

برق صاحب کی اسی کتاب صفحہ ۱۲۸ سے جو عبارت پہلے پیش کی گئی ہے اس میں ایک آیت غور طلب ہے - اور وہ یہ ہے :-

"یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ -

"اے رسول لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ مالی قربانی کی آخری حد کیا ہے ؟ انہیں کہہ دو کہ ہر فالتو اور زاید از ضرورت چیز خدا اور رسولؐ کے سامنے پیش کر دو -"

اس آیت سے بظاہر یہی مفہوم ہوتا ہے کہ فالتو مال کا ایک ذرہ بھی ایک مومن اپنے پاس نہیں رکھتا - اگر صرف یہی ایک آیت انفاق مال کے بارے میں قرآن میں ہوتی - تب بھی اس کا یہ مفہوم ذیل کی وجوہات کی بنا پر قابلِ تسلیم نہ ہوتا -

۱ - قرآن نے فرد کے علیحدہ وجود اور ریت پر بار بار زور دیا ہے - وہ ایک فرد کو جماعت کے تابع تو کرتا ہے - لیکن اس کے باوجود اس کی ذات کو کلی طور پر جماعت میں فنا نہیں کر دیتا - اس حکم کا یہی مفہوم ہو تو

۲ - یہ لازم آتا ہے کہ انسان اپنی ضروریات کے دامن کو اتنا وسیع کر دے گا - کہ فالتو مال کا تصور بھی نہیں کیا جا سکے گا -

۳ - یہ آیت (دوسری آیات کی طرح) ہم پر نازل نہیں ہوئی ہے - کہ ہم اپنی لغت شناسی کی رو سے اس کا مفہوم متعین کریں گے - نہ یہ کوئی اُن‍‍‍‍‍‍‍‍‍‍ن‍ا

سنایا ہوا مقولہ ہے کہ اس کے معنی کی تحدید کے لیے ہماری مرضی ہی آخری حکم ہو گی۔ بلکہ یہ آیت ایک صاحب وحی الہام کی وساطت سے ہم تک پہنچی ہے دیکھنا یہ ہے کہ اس اولین مخاطب کلام الٰہی نے اس کے کیا معنی متعین فرماتے تھے۔ کیا اس کے نزول کے بعد مسلمانوں کا تمام فالتو مال بیت المال میں جمع ہو گیا تھا۔ صرف ایک تاریخی شہادت ہی اس کے ثبوت میں پیش کر دیجئے۔

۴۔ حضورؐ نے اس آیت کا جو مفہوم متعین فرمایا تھا۔ وہ یہی تھا کہ اپنے مال کی زکوٰۃ دو۔ اور وہ زکوٰۃ حضورؐ کے ارشاد کے مطابق جمع مال پر اس کے جمع ہونے کی مدت یک سالہ کے بعد اڑھائی فیصدی تھی۔ اس کے لیے ایک بہت بڑا تاریخی ثبوت موجود ہے۔

۵۔ حضورؐ کی رحلت کے بعد خلیفہ اوّل حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میں کچھ مسلم قبائل کے خلاف حضرت صدیق نے ان کے زکوٰۃ نہ دینے کے جرم میں اعلانِ جہاد فرمایا تھا۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان قبائل نے مقررہ مال بیت المال میں جمع نہیں کروایا تھا۔ کوئی ایسی تاریخی شہادت موجود نہیں ہے کہ انہوں نے جان سپاری سے کسی شدید ملی مطالبہ کے وقت انکار کیا ہو۔ بلکہ وہ اس مقررہ مقدار کو ایک ناجائز ٹیکس اور تاوان سمجھتے تھے۔ اور یہی مقررہ مقدار حضرت رسالت پناہؐ اور ان کی پیروی میں حضرت صدیق اکبرؓ کے نزدیک "عفو" سے مقصود اور متعین تھی۔

۶۔ قرآن پاک میں ہے :-

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

ہم نے جنوں اور انسانوں کو صرف اپنی عبادت کرنے کے لیے پیدا کیا ہے -

اس کا ظاہری اور لفظی مفہوم یہی ہے کہ انسان کا صرف یہی کام ہے کہ شب و روز، ہر آن اور ہر لمحہ میں، جہاں کہیں ہو - جس حال میں ہو - وہ اللہ کی عبادت کرتا رہے —— کیا کثیر المشاغل انسان کے لیے ایسا ممکن ہے -

قرآن کی دوسری کئی آیات عبادت کا مفہوم اور اس کے مختلف طریقے واضح کرتی ہیں - اگر دوسری آیات نہ بھی ہوتیں - اور صرف اسی ایک آیت پر فرضیت عبادت کا دار و مدار ہوتا - تب بھی اس کا یہ مفہوم لینا دانائی سے بعید ہوتا - اور امکان سے دور رہتا -

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کا بھی مفہوم متعین فرمایا - وہی اس کا مفہوم متعین فرمانے کے اہل اور مجاز تھے —— اب ان آیات کا ہونا اور تلاوت کیا جانا اس لیے نہیں ہے - کہ ہم اپنی مرضی سے ان کو نئے معانی دیتے پھریں - بلکہ ان کا وجود اس امر کا مقتضی ہے کہ ہم ان کے مطالعہ کے بعد صحیح مفہوم کو صاحبِ شرع کی مرضی کے موافق جاننے کی کوشش کریں - اور جب کوئی صاحب شرع کی مرضی اور اس کا بیان کردہ مفہوم جان لیتا ہے - تو اس کے لیے ان آیات کی افادی اور افاضی حیثیت وجود پذیر ہوتی ہے -

برق صاحب اور ان کے دوسرے یاران مے کدہ علامہ اقبال مرحوم کو اپنا

پیر و مرشد تسلیم کرتے ہیں۔ اور ان کے اشعار کو بار بار اپنے مقاصد کے لیے حوالہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ گویا انہیں اپنے مرشد سے نسبت رکھنے کا اقرار ہے۔ حضرت علامہ نے جاوید نامہ میں سید علی ہمدانی کشمیری کی عظمت فکر و نظر کا جو اقرار کیا ہے۔ وہ اقبال شناسوں کے لیے محتاج نہیں سید علی ہمدانی رح اپنی کتاب ذخیرہ الملوک میں زکوٰۃ پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"قرآن کی مندرجہ ذیل آیات سے یہ ثابت ہے کہ زکوٰۃ سے مراد کیا ہے۔

(۱) لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْن

کوئی شخص نیکی اور فلاح تک اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ اپنے محبوب مال سے راہ خدا میں خرچ نہ کرے۔

یہاں "مِمَّا" میں "سے" کو صاف بیان کر رہا ہے۔

(۲) اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ۔

جو پاکیزہ مال تم نے کمایا ہے۔ اس میں سے راہ مولا میں خرچ کرو۔

یہاں بھی لفظ "مِنْ" غور طلب ہے۔

(۳) وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّا اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ۔

اللہ کی راہ میں خراب مال دینے کا قصد نہ کرو۔ اگر ایسا ناقص مال تمہیں دینا چاہیں تو تم اسے دل گرفتگی کے بغیر کبھی نہ لو۔

یہاں بھی مِنْهُ ۔ اور عمدہ اور گھٹیا کی تفریق بھی مقدار کو لازم کر رہی ہے

اور سب کا سب، واجب اور ضروری نہیں بتایا جا رہا۔

اس کے باوجود یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر اس (محولہ بالا) آیت کے نازل کرنے کا کیا مقصد ہوا جس میں سب کا سب مال راہِ خدا میں دے دینے کا حکم نکلتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کی رو سے ان معنی میں واجب العمل نو یقیناً ہے۔ لیکن استحبابی طور پر ہم اپنے دعوے کے ثبوت کے لیے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔

جب ابوالقاسم جنید اور ابوالحسن نوری قدس اللہ اسرارھم کو تہمت لگا کر حاکمِ وقت نے گرفتار کر لیا تو ان پر حجت پوری کرنے کا خیال آیا۔ اس مقصد کے لیے ابوالحسن سے پوچھا گیا کہ زکوٰۃ کے متعلق تم کیا کہتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا۔ عامۃ المسلمین کے لیے دو سو درہموں میں سے پانچ درہم۔ اور ہمارے مذہب میں تو یہ حال ہے کہ اگر تمام دنیا بھی درویش کی ملکیت میں ہو تو اس تمام کو بھی ایک لحظہ معرفت اور نعمت کے شکرانہ کے طور پر راہِ مولا میں دے دے۔ ان کا یہ ارشاد اس دلیل پر تھا۔ کہ جب آیت نازل ہوئی۔ مَنْ ذَا الَّذِی یُقْرِضُ اللّٰہ قَرْضًا حَسَنًا۔ کون ہے جو اللہ کو قرض حسنا دیتا ہے۔ تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنا تمام مال بارگاہِ رسالت میں پیش کر دیا۔ اور عمرؓ اپنا نصف مال لائے۔ جب حضرت رسالت مآبؐ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے سوال کیا کہ مَا ذَا الْبَقِیَّۃ لعیالک تم نے اپنے اہل و عیال کے لیے کیا باقی رکھا۔ تو حضرت صدیقِ اکبرؓ نے جواب میں فرمایا۔ اللہ اور اس کا رسولؐ۔ جب حضرت عمرؓ سے

یہی سوال کیا گیا۔ تو انہوں نے فرمایا۔ نصف لے آیا ہوں اور نصف اہل و عیال کے لیے چھوڑ آیا ہوں۔ اس پر حضرتؐ نے فرمایا اللہ کے ہاں تم دونوں میں تمہارے اس کلام کے موافق فرق ہے ۔۔۔ یہ بزرگوار پہلے درجہ کے مومنوں میں ہیں اس کے بعد دوسرا درجہ ان بزرگواروں کا ہے۔ جو اپنے مال کو طاعت الٰہی کو فراغت کے ساتھ بجا لانے کے لیے جمع رکھتے ہیں۔ اور اس مال کی حفاظت امانت کی طرح کرتے ہیں۔ اور خیر کی جگہوں میں اس مال کو خرچ کرتے ہیں۔ اور زکوٰۃ کی مقدار پر اقتصار نہیں کرتے۔ بلکہ اس سے زیادہ (فاضل مال) خرچ کرنے میں مسرّت پاتے ہیں ۔۔۔ ان سے تیسرے درجہ پر عام مسلمان ہیں۔ جن کے لیے واجب مقدار پر قیام کرنا مناسب ہے۔ ان کی ہمّت اس امر کی مقتضی ہے کہ واجب مقدار سے زیادہ خرچ نہ ہو۔ نیز اس واجب مقدار سے کمی بھی نہ کی جائے۔ یہ مرتبہ ادنیٰ ہے اللہ تعالیٰ کی حکمتِ کاملہ نے ان کی مال سے محبت کی زیادتی اور حق سے محبت اور ایمان کی کمزوری کو ملحوظ رکھ کر ان کے حق میں اس مقدار کو بلند فرمایا۔ اس سے زیادہ کا انہیں مکلف نہیں فرمایا گیا۔" [۱]

لہٰذا زکوٰۃ کی مقدار کا تعین لازمی قرار پایا۔ اور سب کا سب فاضل مال خرچ کرنا واجب نہ ہوا بلکہ مستحب رہا۔

منکرین حدیث ایک سوال کر سکتے ہیں۔ کہ اس طرح اسلامی مساوات نہ رہی۔ کہ کوئی تو سب کچھ دے دے۔ اور کوئی چالیسواں حصّہ دے۔ اس

---

[۱] ذخیرہ الملوک ملخص باب زکوٰۃ۔

کا جواب یہ ہے کہ منکرین حدیث کے موجودہ قائد مدیر طلوع اسلام جناب غلام احمد پرویز کو اس فرق مراتب کا اور ان کے باقی رکھنے کا تجربہ حاصل ہے وہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ کہ جب انہوں نے اشاعت فنڈ کے لیے چندے کا مطالبہ کیا۔ تو ایک دو رفیقان بزم نے دل کھول کر امداد کی۔ اور ان سے دوسرے درجے کے معطیوں نے ان سے کم دیا۔ اور تیسرے درجہ پر عام چندہ والے آئے اب زیادہ دینے والوں کو یقیناً پسند کیا گیا ہو گا۔ اور کم سے کم دینے والوں کو بزم سے خارج نہیں کیا ہو گا۔ یہ فرق مراتب رکھنا ہی پڑتا ہے۔ اور اس کی بنا پر مستحب اور واجب کی تقسیم ہوتی ہے۔

اب ایک آیت برق صاحب[۱] کے استدلال کی باقی رہ جاتی ہے۔ وہ یہ کہ۔

خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم و تزکیھم

اس کا ترجمہ انہوں نے یوں کیا ہے ”مسلمانوں سے صدقہ لے کر انہیں مطہر اور مزکی بناؤ۔“[۱]

یہ ترجمہ غلط ہے۔ آپ قرآن کے کسی ترجمہ کو اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ وہ انگریزی میں ہو۔ یا فارسی میں ہو یا اردو میں۔ آپ کو اس مفہوم کا نام و نشان نہ مل سکے گا کہ ”مسلمانوں سے صدقہ لے کر“۔ برق صاحب اگر اس کا درست ترجمہ کرتے تو ان کے استدلال کے جملہ ارکان ٹوٹ جاتے۔ ترجمہ یہ ہے۔ ان (مسلمانوں) کے اموال میں سے صدقہ لیجئے۔ اور اس قبولیت سے انہیں

---

[۱] دو اسلام ص ۱۲۶

مطہر اور مرزکی کیجئے۔ جو لوگ قرآن کو اپنے مطالب پہنانے میں اتنے دلیر ہوں۔ ان کا یہ مطالبہ کتنا خطرناک ہے کہ حدیث سے بے نیاز ہو کر۔ قرآن سے قانون سازی کا کام لو ۔۔۔ یعنی ہماری مرضی کا قرآن پر حاکم ہونا۔۔۔ تسلیم کر لو۔

ہماری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ منکرین حدیث کی اس تمام جدوجہد کا مقصد یہ ہے کہ زکوٰۃ کا مفہوم اس طرح بدل دیا جائے کہ ہر قسم کا انفاق مال زکوٰۃ سمجھا جانے لگے اور جب کوئی جابر حکمران انتہائی سرکوب قسم کے ٹیکس رعایا پر لگا دے۔ تو اس سختی کے خلاف سارے ملک سے ایک آواز بھی بلند نہ ہو۔ اور اگر کوئی سرپھرا اسے ظلم وستم قرار دے۔ تو اسے خدا کا باغی۔ زکوٰۃ کا منکر۔ قرآن کا دشمن اور ملّت کا غدار ثابت کیا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی مستحسن پروگرام نہیں ہے۔ ہم اس گمان کے وجود میں آنے کے چند شواہد پیش کرتے ہیں۔

ان سے کسی صاحب نے سوال کیا تھا۔ "زکوٰۃ کے علاوہ دیگر ٹیکس جو حکومت لوگوں سے لیتی ہے۔ ان کے جواز یا عدم جواز کے بارے میں جناب کی کیا رائے ہے۔ کیا دیگر مروّجہ ٹیکسوں کی موجودگی میں زکوٰۃ کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ یا زکوٰۃ کو بحال رکھ کر ان کو نظر انداز کرنا مناسب ہو گا"۔ [۱]

اس سوال کے آخری فقرے پر ہاں کہنا طلوع اسلام کے مدیر کی ہمّت سے بہت زیادہ تھا۔ یہ کام امام مالکؒ۔ اور احمد بن حنبلؒ کے سے کاملوں کا

۱۔ طلوع اسلام اگست ۶۱ء ص ۱۲

ہوتا ہے۔ ع

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

پرویز صاحب نے جو جواب دیا۔ آپ اس کے ملاحظہ پہ ان کی فراست کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ ہم بھی ان کی ذہانت اور نکتہ سنجی کے اس میدان میں معترف ہیں۔ اور یہ مانتے ہیں کہ اگر وہ سلیم شاہی یا اکبری عہد میں ہوتے تو شیخ الاسلام کی مسند عالی کو زینت بخشتے اور اسلام کا ایسا عمدہ ایڈیشن تیار فرماتے کہ ان کی اس مخدوم الملکی کو دیکھ کر شیخ مبارک اور شیخ علائی کا ہرٹ فیل ہو جاتا۔

پرویز صاحب فرماتے ہیں ـــ "اسلامی حکومت نوع انسانی کی نشوونما کے لیے جو کچھ افراد مملکت سے لیتی ہے۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ جب اسلامی حکومت نہ ہو تو زکوٰۃ کی حیثیت محض خیرات کی رہ جاتی ہے۔ اور حکومت کے ٹیکس اپنی جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ زکوٰۃ کے نصاب یا شرح وغیرہ کا ذکر قرآنِ کریم میں نہیں۔" [۱]

اس جواب میں صاف گوئی اور مسئلہ کی وضاحت نہیں ہے۔ "جو کچھ" نہایت خطرناک مبہم اور تانگہ والوں کا "جو جی چاہئے دے دینا" کی قبیل سے غیر واضح اور پریشان کن ہے "افراد مملکت" میں مسلم اور غیر مسلم سب شامل ہیں۔ کیا ان سے لیا ہوا مال بھی زکوٰۃ ہوگا۔ اگر کہا جائے کہ افراد کی

---

[۱] حوالہ ما سبق ص ۱۲

یہ تخصیص روا نہیں تو سوال پیدا ہوگا کہ پھر حکومت کی تخصیص کیوں روا ہوئی ـــــ "اسلامی حکومت"، کس لیے فرمایا گیا۔ فرمایئے اس کا کیا حل ہوا۔ اگر یہ تخصیص بھی نہ رہی تو کیا پنڈت نہرو کو ہندوستان کے مسلمان وہ جو کچھ "دیتے ہیں وہ زکوٰۃ ہے۔ اگر زکوٰۃ ہے تو پنڈت جی کا خزانہ بیت المال ہوا اور وہ ٹھہرے اُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ" اور جب منکم میں شامل ہوگئے تو مال دینے والے اور لینے والے سب ایک ہی مشرب کے بن گئے۔ رہے نام اللہ کا۔ "قرآن کی اصطلاح"، کیا معنی۔ اصطلاح تو تب ہوئی جب قرآن کے اولین مخاطب اور ان کے عہد میں لفظ زکوٰۃ کو لغت کے معنوں سے ذرا ہٹا کر نئے معنی دے جانے کو آپ تسلیم کرتے ہوں۔ جب آپ لوگ لفظ زکوٰۃ کو لغت ہی کے معنوں میں برقرار رکھنے پر مصر ہیں تو پھر اصطلاح کہاں سے آگئی۔ شعر کے معنی جو لغت کی رو سے ہوں اصطلاحی معنوں سے الگ ہوتے ہیں۔ غزل لغت کی رو سے جو معنی رکھتی ہے۔ اصطلاح میں ان معانی میں توسیع اور تخصیص ہوگئی ہے۔ اصطلاح لغت پر اضافہ کرتی ہے۔ اور یہ اضافہ کبھی تخصیص وتعین سے ہوتا ہے۔ کبھی توسیع اور تجدید سے۔ مثلاً لغت کی رو سے پاکستان کے معنی ہیں۔ پاک اور مطہر جگہ۔ خواہ وہ جگہ رقبہ میں دو مربع فٹ ہی کیوں نہ ہو۔ امریکہ میں ہو یا آسٹریلیا میں، لنکا میں ہو یا جاوا میں۔ سینۂ زمین پر ہو۔ یا سینۂ انسان میں ہو۔ اور اصطلاح کی رو سے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت ہے۔ جس کے لیے اسلامی دستور وقانون کی ضرورت ہے۔ اور

اس ضرورت کو آپ ایسے بزرگوار "پوار" کر رہے ہیں۔

"زکوٰۃ کی حیثیت محض خیرات" کی غیر اسلامی حکومت میں کیسے رہ جاتی ہے۔ قرآن کی کس آیت کی رو سے۔ اور کیوں؟ ایک اہل قرآن کو یہ زیب نہیں دیتا۔ کہ اس بات کا دعوٰی کرے جو قرآن کی رو سے مسلّم نہ ہو سکتی ہو۔ قرآن میں غیر اسلامی حکومت کا ذکر ہی کہاں ہے کہ اس کے مطالعہ سے آپ نے یہ استخراج و استدلال فرمایا ہے۔

"زکوٰۃ کے نصاب یا شرح کا ذکر قرآن کریم میں نہیں"

درست ہے — بجا فرمایا آپ نے! — یہ تو فرمایئے کہ قرآن کسی پر نازل بھی ہوا تھا۔ یا آج کل آسمان کی وسعتوں سے ریڈیائی طور پر نازل ہو رہا ہے۔ کہ آپ ہی کے ذمے غیر متعینہ امور کا تعین پڑ گیا۔ جس پر نازل ہوا تھا۔ اس نے اس کے اوامر و نواہی کا تعین بھی فرمایا ہے۔ اگر وہاں سے روشنی لی جائے تو یہ سارا قضیہ ہی طے ہو جائے۔ مگر آپ کو تو اس سرمایہ ہی سے نفرت ہے۔

پرویز صاحب اپنی کتاب مفہوم القرآن کا تعارف کراتے ہوئے اصطلاحات کے زیر عنوان لکھتے ہیں:-

"زکوٰۃ — اسی طرح مثلاً زکوٰۃ کی اصطلاح ہے۔ اس لفظ کا مادہ (ز - ک - و) ہے۔ جس کے بنیادی معنی بڑھنا۔ پھولنا۔ پھلنا۔ نشو و نما پانا ہیں .... زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم یہ ہے کہ اپنی دولت میں سے ایک شرح کے مطابق روپیہ نکال کر خیرات کے کاموں میں صرف کیا جائے اس میں شبہ نہیں کہ اس میں بھی زکوٰۃ کے قرآنی مفہوم کی ایک جھلک پائی جاتی ہے

لیکن قرآنِ کریم نے اسے ان خاص معانی میں استعمال نہیں کیا اس لیے اس اصطلاح کو اپنے معانی کے لیے مخصوص کر دینا قرآنی مفہوم کی وسعت اور ہمہ گیری کو مقید کر دینا ہو گا۔ [1]

بندہ پرور —— اصطلاح سے مراد ہی یہی ہوتی ہے۔ کہ کسی لفظ کے مروجہ مفہوم کو ہی اس کا متعینہ اور مطلوبہ مفہوم سمجھا جائے۔ اور وہ اصطلاح انہی مروجہ معانی کے لیے مخصوص ہوا کرتی ہے۔ یہی تخصیص اسے اصطلاح بناتی ہے ورنہ وہ لفظ نرا لغت رہ کر وضعی معنی لیتا رہتا ہے۔ جب زکوٰۃ کا لفظ اصطلاح ہے۔ تو اس کے مروجہ معنی درست ہیں۔ اور لغت کے پیچھے لٹھ لے کے بھاگنا ایسے ہی ہے۔ جیسے ہر پاک جگہ کو پاکستان کہنا۔

نماز

نماز کے متعلق منکرین حدیث کے ائمہ سے جب بھی کسی نے استفسار کیا۔ تو انہوں نے فرمایا موجودہ صورت ہی کو بحال رکھنا درست ہے۔ جب ان سے نماز کی تفصیلات سے بحث کی گئی تو صرف قرآن کی رو سے نماز کی صورت، ارکان کے تعین، ابتدا اور انجام پر کوئی روشنی نہ ڈال سکے۔ [2]

جدید منکرین حدیث کو اس کمزوری کا احساس بڑی شدت سے ہے۔

---

[1] طلوعِ اسلام اگست صفحہ ۱۷ ۔ [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب اقبال اور منکرینِ حدیث۔

اب ہم آپ کے مطالعہ کے لیے ان کی نگارشات کے حوالے پیش کرتے ہیں۔

"اگر ہم احادیث کے مطابق نماز پڑھنا شروع کر دیں تو ہر مسجد کی نماز دوسری سے مختلف ہو جائے گی ۔۔۔ رسول کریم صلعم کو لاکھوں مسلمانوں نے نماز پڑھتے دیکھا۔ انہیں کروڑوں نے اور یہ سلسلہ ہم تک پہنچا۔ کیا ان اربوں کھربوں انسانوں کی شہادت کافی نہیں؟ کیا دیہاتی مسلمان صحیح بخاری سے نماز کا طریقہ سیکھا کرتے ہیں۔ جس طریقے سے ہمارے آباؤ اجداد نماز ادا کرتے رہے۔ ہم نے وہ سلسلہ جاری رکھا۔ اور اب ہماری اولاد نقل اتار رہی ہے۔ یہاں صحیح بخاری کی ضرورت ہی کہاں پیش آتی ہے۔ کشمیر کی ساری وادی میں غالباً صحیح بخاری کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہو گا۔ لیکن پھر بھی وہ نہایت صحت سے نماز پڑھتے ہیں۔" ؎۱

برق صاحب نے جس سہل طریقے سے اس نہایت سخت مشکل سے کنارہ گیری کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ وہ قابل داد ہے۔ کیا وہ پاکستان کے تمام اہل علم کو اس درجہ کم فہم سمجھتے ہیں۔ کہ وہ برق صاحب کے اس خلط مبحث کو نہ سمجھ سکیں گے۔ یہ درست ہے کہ متاخرین مسلمانوں نے اپنے آباؤ اجداد کو جس طرح نماز پڑھتے دیکھا۔ انہوں نے ان ہی کی طرح پڑھنا شروع کیا۔ لیکن یہ تو فرمایا ہوتا۔ کہ ان تازہ واردان بساط دین نے قدما کی جو نقل اتاری اس میں انہوں نے صرف حرکات ہی کو قبول کیا۔ یا حرکات و سکنات کے دوران میں کچھ کلمہ کلام بھی پڑھا کیے۔ ظاہر ہے کہ کلمات بھی انہوں نے اپنے اپنے

؎۱ "دو اسلام" ص ۱۳۴ — ۱۳۵

پیشروؤں سے سیکھے ہیں۔ ان پیش رو بزرگوں نے کلمات اور طریقۂ نماز بتاتے وقت کسی تحریری سرمائے کی طرف بھی رہنمائی کی ہوگی۔ اور اپنے عمل کو درست ثابت کرنے کے لیے یقیناً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور اعمال کو بطور سند پیش کیا ہوگا۔ یہ بھی خوب بات ہے کہ دیہاتی مسلمان صحیح بخاری سے نماز نہیں سیکھتے۔ اور ساری وادی کشمیر میں بخاری کا کوئی نسخہ نہیں ہوگا۔ یہ درست ہے کہ دیہاتی مسلمان بخاری سے براہِ راست نماز کا طریقہ نہیں سیکھتے۔ لیکن اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ یہ سادہ مسلمان جن علماء سے نماز کا طریقہ سیکھتے ہیں۔ وہ بخاری ہی کی رو سے انہیں تعلیمات دیتے ہیں — لہذا بخاری سے بے نیازی کے کیا معنی؟۔ کشمیر کی وادی میں بخاری کا نسخہ نہ ہونا۔ برق صاحب کی بہت بڑی خوش فہمی ہے۔ اور کشمیریوں پر بہت بڑا بہتان ہے۔

رہا جواب کا یہ حصہ کہ احادیث کے مطابق نماز پڑھنے سے ہر ہر مسجد کی نماز مختلف ہو جائے گی۔ اس کا تفصیلی جائزہ ہم برق صاحب کی کتاب ”دو اسلام“ کے باب دہم پر بحث کرتے وقت پیش کریں گے۔

”قرآن حکیم نے اس الفاظ (لفظ صلوٰۃ) کو مندرجہ ذیل معانی میں استعمال کیا ہے۔ اول تعریف و حوصلہ افزا الفاظ .... وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّ صَلَوٰتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (التوبۃ ۱۰۳) اے رسول تو تعریفی الفاظ سے ان صحابہ کا حوصلہ بڑھا کہ تیری تعریف سے انہیں سرور اور سکون حاصل ہوتا ہے۔

دوم :- ذکر، چرچا، تشہیر، پروپیگنڈا …… قرآن مجید نے پروپیگنڈا کو بڑی اہمیت دی ہے — بار بار ذکر (تشہیر۔ پبلسٹی) پر زور دیا ہے۔

یَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ۔

مسلمان کا کام اٹھتے، بیٹھتے اور سوتے اللہ کا پروپیگنڈا (ذکر) کرنا ہے۔

سوم :- مذہب، ضابطہ حیات، آئین بقا۔ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس ضابطہ حیات یعنی سارے قرآن کی تعمیل کر رہے ہیں۔ نہ کہ وہ جو مسجد میں چند منٹ ماتھا ٹیکنے کے بعد ہر چار سو جھوٹ، فریب اور بد دیانتی کی غلاظت بکھیر رہے ہوں۔ صلوٰۃ پورے قرآن اور پورے دستور العمل کا نام ہے۔ اور نمازی وہ ہیں جو اس صلوٰۃ کو بقدر امکان نباہ رہے ہوں۔ یہی وہ صلوٰۃ ہے جو فحش اور منکر سے لازماً روکتی ہے۔ …… یہی وہ سرچشمہ ہدایت ہے جسے چھوڑ کر ہمارے بعض نمازی اور حاجی چور بازاری امرد پرستی۔ اور دیگر فنونِ جنسی کے امام بنے ہوئے ہیں۔ [1]

چہارم :- دعا اور عبودیت کا اقرار …… …… وغیرہ۔" [2]

برقی صاحب کے اجتہاد کے بعد طلوع اسلام کے مدیر پرویز صاحب کے ارشادات ملاحظہ کیجئے :-

---

[1] سبحان اللہ مصلح صاحب کی زبان اور اصلاح کا انداز کتنا پاکیزہ ہے۔
[2] ۔ ایک اسلام ص ۳۱۱ تا ص ۳۲۳

" قرآن کریم میں صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے جو معنوی اعتبار سے بڑا وسیع اور جامع ہے۔
اس کے بنیادی معنی کسی کا اتباع یا اطاعت یا محکومیت اختیار کرنا ہیں۔ قرآن کریم
نے اس لفظ کو نماز کے اجتماعات کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ (اس کے بعد صلوٰۃ
کے مختلف مفاہیم کا ذکر ہے) صلوۃ کے جو مختلف مفاہیم اوپر بیان ہوئے ہیں۔
ان سے ظاہر ہے کہ ایک عبد مومن، زندگی کے جس گوشے میں بھی قوانین خداوندی
کے مطابق اپنے فرائض منصبی ادا کرتا ہے ــ وہ فریضہ صلوٰۃ ہی کو ادا کر رہا ہوتا
ہے۔ اس کے لیے وقت، مقام یا شکل کا تعین ضروری نہیں۔ لیکن قرآن کریم
میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں۔ جہاں صلوٰۃ کا لفظ ایک خاص قسم کے عمل کیلئے
استعمال کیا گیا ہے۔" [1]

چلو چھٹی ہوگئی ــــ صلوٰۃ کا بیان نماز کے اجتماعات کے لیے بھی ہوگیا۔
اور جو شخص کوئی اور کام بھی کر رہا ہو۔ وہ بھی نماز ہی ہوگیا۔ بشرطیکہ فرض منصبی
ادا کر رہا ہو۔ گویا دفتر کا کام کرنے کے دوران میں ایک کارندہ چونکہ فرض منصبی
ادا کر رہا ہوتا ہے۔ اور یہ کارکردگی صلوۃ ہی ہوتی ہے۔ لہذا اس کا رسمی
نماز کے لیے کام کو چھوڑ کر جانا، قرآن کی رو سے غیر ضروری ہوگیا۔ اس
طرح امت میں حیلہ سازی اور نماز سے دوری کا جو دور چل سکتا ہے اس کے
زور کا اندازہ لگانا اتنا مشکل نہیں ہے۔

اس سے ذرا آگے لکھتے ہیں:-

" امت کے مختلف فرقے جس جس طریقے سے نماز پڑھتے چلے آرہے

---

[1] طلوع اسلام نومبر دسمبر ۶۱ء ص ۱۰

ہیں - ان میں کسی قسم کے ردو بدل کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں - اسی وجہ سے میں اہل قرآن سے بھی اختلاف رکھتا ہوں جنہوں نے اپنے لیے الگ نماز تجویز کر رکھی ہے سلہ - البتہ میں یہ ضرور کہتا ہوں - کہ اگر مسلمانوں میں پھر سے خلافت علیٰ منہاج نبوت کا قیام ہو جائے اور وہ تمام امت کے لیے نماز کی ایک ہی شکل تجویز کر دے - تو یہ امت میں وحدت... پیدا کرنے کے لیے بڑا موثر اقدام ہو گا..... " سلہ

اہل قرآن نے الگ نماز تجویز کر کے امت میں انتشار پھیلا دیا ہے - ان کے پاس اس اختلاف کے جواز پر اور اپنی نماز کی ہیئت اور ترتیب پر کوئی دلیل نہیں - اس لیے انہیں ہر مباحثے میں فاش شکست ہوتی رہی ہے - پرویز صاحب کو ان کی اس کمزوری کا علم ہے - لہذا وہ اس شعبے میں ان کے ہمنوا نہیں - اہل قرآن کی یہ خامی حدیث سے بے نیاز ہونے کی وجہ سے ہے - اور پرویز صاحب نے - اس کا علاج یہ سوچ رکھا ہے - کہ نماز کی مروجہ صورت کو سردست بحال رکھنے کا اعلان کر دینا قرین مصلحت ہے - ورنہ اعتراضات کا کوئی جواب اہلِ قرآن کی طرح نہ ہو سکے گا - اس لیے وہ تبدیلی کو خلافت منہاج نبوت کا کام قرار دیتے ہیں - اور اہل قرآن سے اختلاف کا اظہار کرتے ہیں - اگر اتفاق کا اقرار ہوتا تو پھر نماز پر جو "رفیقانہ" وار کیا جا رہا ہے جو غیر موثر رہتا -

---

سلہ - اس وقت کے علماء نے اہل قرآن پر جو تنقید کی اس کا ایک خاکہ راقم کی کتاب "اقبال اور منکرین حدیث" میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے - سلہ صہ !! -

اہل قرآن سے نماز کے ارکان کے بارے میں بار بار سوالات ہوتے رہے ہیں اس کا انہوں نے ایک سے ایک نرالا جواب دیا ہے ـــ پرویز صاحب اس ضمن میں فرماتے ہیں۔

"انسان اپنے جذبات کا اظہار جسم کے اعضاء کی محسوس حرکات سے بھی کرتا ہے۔ اور یہ چیز اس میں ایسی واضح ہو چکی ہے کہ اس سے یہ حرکات خود بخود سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ غم، غصہ، خوشی، تعجب، عزم و ارادہ، ہاں اور نہ وغیرہ قسم کے جذبات اور فیصلوں کا اظہار ان کی طبعی حرکات سے بلا ساختہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت جذبات، عزت و احترام، اور اطاعت و انقیاد کے اظہار کی ہے تعظیم کے لیے انسان کا سر بے اختیار نیچے جھک جاتا ہے۔ اطاعت کے لیے سر تسلیم خم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ قرآن کریم عمل کی روح اور حقیقت پر نگاہ رکھتا ہے۔ اور محض فارمل ازم کو کوئی وزن نہیں دیتا۔ لیکن جہاں کسی جذبہ کی روح اور حقیقت کے اظہار کے لیے فارم کی ضرورت ہو۔ اس سے روکتا بھی نہیں۔ بشرطیکہ اس فارم ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لیا جائے۔ صلوٰۃ کے سلسلہ میں قیام و سجدہ وغیرہ کی جو عملی شکل ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ اس مقصد کے لیے ہے۔" [۱]

ارکان نماز کی مروجہ صورت کو انسان کی بے ساختہ طبیعی حرکات کا نتیجہ بھی قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ان کو پسند بھی کیا گیا ہے۔ اگر ناپسند کرتے تو نئے ارکان پیش کرنے کا سوال ہوتا۔ اور وہ قرآن میں ملتے نہیں ہیں ـــ

---

[۱] ۔ طلوع اسلام نومبر ۔ دسمبر ۶۱ء ص ۱۰

(سوائے رکوع و سجود کے)۔ اگر بالکلیہ پسند کرتے تو سوال پیدا ہوتا کہ ان کا طریقہ قرآن کی رو سے تو مقرر نہیں ہوا۔ حدیث کی رو سے متعین ہے۔ اس سے حدیث قرآن کی شارح ہو گئی۔ یہ بات انہیں کیسے قبول ہو سکتی ہے ـــــ اس لیے ان حرکات کو انسانی طبع کا ایک خاصہ بتا کر ان تمام مشکلات سے نجات حاصل کر لی گئی۔

لیکن ایک الجھن اب بھی باقی رہ ہی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر انسانی طبع کے اقتضا کے طور پہ ایسی حرکات نے جنم لیا ہے تو تمام مذاہب کے ہاں اسی طرح کی حرکات اظہار عبودیت کیلئے ہوتیں۔ ان میں تفاوت کیوں ہے۔ نیز ایک سجدہ کی جگہ ہر رکعت میں دو سجدے کیوں ہیں۔ تین یا چار کیوں نہیں۔ یا ایک مسلسل لمبا سجدہ کیوں نہیں۔ رکوع کے بعد سجود کیوں ہے۔ ان کے درمیان قعدہ کیوں ہے۔ انسانی طبع اظہار عبودیت کے سر تسلیم بھی خم کراتی ہے۔ اور شدت جذبات میں سجدہ بھی کراتی ہے۔ یہ درست ہے۔ مگر قیام، رکوع سجود اور قیام سے سجود تک پہنچنے کا مروجہ طریقہ کسی نہایت دانا حکیم کے حکم کو اپنی تقرری کے لیے لازم بتلاتا ہے۔ شدت جذبات میں قیام کا سوال ہی نہیں رہتا۔ اور اگر قیام کے وقت جذبات میں شدت آجائے تو فی الفور دھڑام سے سجدہ ریزی انسانی طبع کے موافق معلوم ہوتی ہے۔ نہ کہ رکوع۔ اس کے بعد حالتِ قیام۔ اس کے بعد سجدہ وغیرہ۔

پرویز صاحب۔ اس عہد کے تمام منکرین حدیث سے زیادہ جہاندیدہ اور اپنے پیش رو حضرات کی شکستوں سے پورا پورا سبق لینے میں نہایت

مشتاق ہیں۔ ان کے قلم میں زور ہے۔ قوت استدلال سے بہرہ مند ہیں۔ تاویل میں یہ طولٰے رکھتے ہیں۔ لہذا ہمارے نزدیک حدیث کے خلاف ان کے ارشادات امّت کے لیے زیادہ نقصان دہ ہیں۔ ان کے مقابلے میں دوسرے "کرم فرما"، کم درجہ کے بزرگوار ہیں۔ ان کے قلم سے بعض دفعہ اپنے اماموں کے متعلق ایسے الفاظ بھی پھوٹ نکلتے ہیں کہ جن سے ان کی خامی عیاں ہو جاتی ہے۔ لیکن پرویز صاحب اس میدان کے کامیاب شہسوار ہیں۔

مدیر البیان دو اسلام کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"آج سے ۵۰ — ۶۰ سال پہلے اسی شہر لاہور سے ایک آواز بلند ہوئی کہ اسلام وہ نہیں۔ جو رائج ہے۔ بلکہ اسلام پورے کا پورا قرآن۔ تنہا قرآن کے اندر موجود ہے۔ یہ ابتدائی قدم تھا بنیادی صداقت کی طرف، لیکن اس میں لڑکھڑاہٹ تھی — لغزشیں تھیں، اس کا دعویٰ صحیح، دلائل صحیح، لیکن جو اسلام اس کے داعیوں نے پیش کیا (داعی اول۔ مولوی عبداللہ چکڑالوی) وہ بھی مروجہ اسلاموں ہی کی طرح ایک فرقہ بندانہ کوشش تھی۔ جو پنپ نہ سکی۔ لیکن فضا میں ایک عظیم چھوڑ گئی"۔ ؎۱

بعد کے منکرین حدیث نے ان لغزشوں کو پیش نظر رکھا۔ اور حملے کا انداز بدل دیا۔ اس انداز کی بنیادی بات یہ ہے کہ سردست ارکان اسلام میں زیادہ دخل اندازی نہ کی جائے۔ تاہم موقع ملنے پر نماز، روزہ، زکوٰۃ کے مروجہ مفہوم پر کاری ضرب بھی لگاتے جائیے۔ اور جب ضرب کی قوت آزمائی جائے گی۔ اور مضروب کے

؎۱ دو اسلام ص ۲۹

حوصلہ کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔ تو وہ وقت ریلے کا ہوگا۔

اس کی ایک مثال ہم پرویز صاحب کی تشریح ارکان پر بحث کرتے وقت دے آئے ہیں۔

"قرآن کریم کی ایک اصطلاح اقامتِ صلوٰۃ ہے۔ جس کے عام معنی نماز قائم کرنا یا نماز پڑھنا کیے جاتے ہیں۔ لفظ صلوٰۃ کا مادہ (ص۔ل۔و) ہے جس کے بنیادی معنی کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہیں۔ اس لیے صلوٰۃ میں قوانین خداوندی کے اتباع کا مفہوم شامل ہوگا بنا بریں اقامت صلوٰۃ سے مفہوم ہوگا۔ ایسے نظام معاشرہ کا قیام جس میں قوانین خداوندی کا اتباع کیا جائے۔ یہ اس اصطلاح کا وسیع اور جامع مفہوم ہے۔۔۔۔۔" [۱]

یہاں بھی یہی طریقہ کار فرما نظر آتا ہے۔ یعنی اقامت صلوٰۃ کے عام معنی نماز ہوئے اور جامع اور وسیع مفہوم۔ اسلامی معاشرہ کا قیام ہوا ——— یعنی سردست مفہوم کی تقسیم کر دی جائے۔ اس کے بعد نیا مفہوم رائج کرنے اور مروجہ مفہوم کو محو کرنے کا کام ممکن ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ دین کے استحکام کے لیے نہایت نقصان دہ ہے۔ ہم اسلامی معاشرے کے قیام کی جدوجہد کے حق میں ہیں۔ لیکن اسے اقامت صلوٰۃ قرار دینے پر ہمیں اس لیے سخت اعتراض ہے کہ دینی معاشرے کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے کی ضرورت اس اصطلاح کے ذریعے سے واضح نہیں ——— بلکہ اس اصطلاح کی رو سے قرآن مومنوں کے دلوں کی اصلاح کرنے کا اور ان میں اسلامی یک جہتی پیدا کرنے

---

[۱] طلوع اسلام اگست ۱۹۷۱ء ص ۲۱

کا خواہاں ہے۔ اس کے بعد ان کی جدوجہد اسلامی معاشرے کو جنم دے سکتی ہے۔ اگر اس اصطلاح کو جدوجہد کے لیے مقرر کیا جائے۔ تو اس طرح مومنوں کی جدوجہد پاکی قلب و نظر سے بے بہرہ ہونے کی بنا پر غیر اسلامی جدوجہد ہو گی۔ جب کہ وہ صلوٰۃ (نماز) سے بے نیاز ہو کر مصروفِ عمل ہوں گے۔ جدوجہد صرف جدوجہد ہونے کی حیثیت سے حسن نہیں رکھتی۔ یہ حسن صرف اس وقت پیدا کرتی ہے۔ جب امن پسندی اور خدا پرستی کے جذبات کی رہین ہو۔ ورنہ یورپ اور امریکہ کی جدوجہد کو حسن ماننا پڑے گا۔ حالانکہ ان کی جدوجہد انسانیت کو تباہ کر دینے کے درپے ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ کہ حدیث سے ہٹ کر دینِ اسلام کے ارکان کی اس جدید تشریح نے زکوٰۃ اور نماز کے چودہ سو سالہ مروجہ مفہوم کو کس طرح مسخ کرنے کی کوشش کر رکھی ہے۔ گویا ان دونوں ارکان سے گلو خلاصی کرانا ان شارحین کے پروگرام میں شامل ہے۔

روزہ:۔

جدید منکرین حدیث کے اماموں نے روزوں کے تعین اور مسائل سے متعلق جو باریک بینیاں امت کے سامنے پیش کی تھیں۔ اور ان کا بودا پن اس وقت کے علماء نے واضح کیا تھا۔ اس کا ایک خاکہ اقبال اور منکرین حدیث میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ ان بزرگواروں میں سے ایک صاحب نے تین روزے فرض بتائے تھے۔ اس پر ان کا نام "سہ روزی" پڑ گیا تھا۔ اس وقت کے منکرین حدیث

روزہ کے جملہ احکام کو قرآن سے ثابت کرنے کے دعویدار تھے۔ مگر مطالبہ پر دعوے کو ثابت نہ کر سکے۔ دیکھئے جدید منکرین کی روش اس میدان میں کیسی ہے۔

قرآن میں صوم سے متعلق جو آیات ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل آیت منکرین حدیث کی توجہ کا ہمیشہ سے مرکز رہی ہے۔ منکرین حدیث پرانے ہوں یا نئے۔ انہوں نے اس آیت کے معانی بیان کرتے میں تمام اہل علم سے اختلاف کیا ہے۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

ان آیات میں سے یطیقونہ والی آیت نہایت غور طلب اور اہم ہے۔ اس کی تشریح کرنے سے پہلے برق صاحب لفظ فدیہ کے مفہوم اور مصرف کا جائزہ لے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ فدیہ بدلہ اور تلافی کے مترادف ہوتا ہے۔ ازاں بعد اس طرف بڑھتے ہیں کہ جب مترجمین نے اس آیت سے یہ مفہوم نکالا ہے کہ روزہ نہ رکھنے والا فدیہ بھی دے اور روزہ بھی رکھے۔ وہ سخت غلطی پر ہیں۔ ملاحظہ ہو:۔

" یطیقونہ کو صرف سلبی معنوں میں استعمال کرنے کے لیے زبردست

قرینہ درکار ہے جو یہاں موجود نہیں۔ مزید برآں جب یطیقون ایجابی معنوں میں استعمال ہو کر ایک نہایت مفید ہدایت[1] ہم تک پہنچا رہا ہے۔ اور یہ ہدایت کسی اور نص سے متصادم نہیں ہو رہی۔ اور نہ تقاضائے بر و تقوٰی کے خلاف ہے۔ تو اسے خواہ مخواہ ایجابی معنوں سے محروم کرنا درست نہیں .... بالغرض اگر ہم یطیقون کو سلبی معنوں ہی میں لے لیں۔ تو ترجمہ آیت یہ ہوگا۔ جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے۔ وہ فدیہ ادا کریں۔ لیکن اگر وہ روزہ رکھ لیں تو بہتر ہے۔ حیرت ہے کہ اللہ تعالےٰ ان لوگوں کو روزہ کی ترغیب دے رہا ہے جن میں روزہ رکھنے کی طاقت نہیں (اس کے بعد فدیہ کے مختلف مفہوم کو پیش کر کے لکھتے ہیں) ان امثلہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ کہ صوم اور فدیہ صوم یک جا جمع نہیں ہو سکتے۔ اگر کسی روزہ دار نے فدیہ کو ادا کر دیا ہے۔ تو وہ صوم کا مکلف نہیں رہا۔ (اس مطلب کو درست ثابت کرنے کے بعد مختلف تراجم کو درج کتاب کیا گیا ہے۔ اور ان سب میں نقص بنایا گیا ہے) (الشیخ الاظہر علامہ جوہری طنطاوی مصری کا ترجمہ انہیں مفید مطلب نظر آتا ہے) اس کا بیان ملاحظہ ہو:۔

"اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ اور پھر بھی نہیں رکھتے۔ وہ فدیہ دیں۔ یعنی جن لوگوں کو روزے میں اتنی تکلیف ہوتی ہے۔ کہ روزہ ان کے گلے میں مصیبت کا ہار بن جاتا ہے۔ وہ فدیہ دے کر گلو خلاصی کرا سکتے ہیں اور یہ فدیہ اس تقصیر فی العبادت کا بدلہ سمجھا جائے گا۔ علامہ نے ترجمہ

کرتے وقت یطیقون کو پیش نظر رکھا۔ اور تفسیر میں یطوقون یہاں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ان (الفاظ) کے مفہوم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لا یطیقون سے مراد صرف ضعیف اور سن رسیدہ بوڑھے ہیں۔ اور یطوقون سے وہ لوگ جنہیں روزہ تکلیف دیتا ہو۔ خواہ وہ جوان ہوں یا بوڑھے۔ چونکہ گرمیوں کا روزہ تقریباً ہر آدمی کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس لیے ہر آدمی فدیہ دے سکتا ہے۔" ؎۱

گویا یہ سارا زور تحقیق اور بحث مباحثہ صرف اسی رعایت کے لیے تھا۔ ان آخری دو فقروں کا مطالعہ ہر مسلمان کے لیے اس لحاظ سے نہایت عبرت ناک ہے کہ ایماندار آدمی کو اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جب انسان کسی شرعی حکم سے گلو خلاصی کرانا چاہے تو اس کے لیے کتنے حیلے بہانے کرتا ہے۔

یہی برق صاحب ہیں۔ جو جہاد کو ہر فریضہ سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور وہ اسلام میں ان جملہ حدیثوں کو وضعی گردانتے ہیں۔ جن میں جہاد کے ساتھ دوسرے نیک کاموں کو بھی بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

(۱) ایک مرتبہ حضرت عائشہ نے حضور علیہ السلام سے پوچھا۔ کہ ہمارے رائے میں جہاد بہترین عمل ہے کیا ہم جہاد نہ کیا کریں۔ فرمایا نہیں بلکہ حج بہترین عمل ہے ـــــ چلو اہل عرب اور ہمارے امراء کی تو جہاد سے خلاصی ہوئی۔ قلت وسائل کی وجہ سے ہمارے لیے حج مشکل تھا۔ لیکن ہمارے امراء کے لیے نہایت آسان۔ اور اہل عرب کے لیے آسان تر۔ کہ انہیں زیادہ

؎۱ جہان نو ص ۲۷۵ تا ص ۲۹۰

مصارف برداشت نہیں کرنا پڑتے تھے۔ گھر سے نکلے اور ایک دنبہ ذبح کیا۔ کعبہ کے دو چار چکر لگائے۔ مغفرت کا پروانہ مل گیا۔ اور گھٹیا قسم کے جہاد سے جان چھوٹ گئی۔ بڑھیا جہاد والے کو کیا پڑی ہے کہ جان دے کر گھٹیا جہاد کرتا پھرے۔"[1]

یہاں برق صاحب نے جہاد کو نہایت اہمیت دی ہے۔ اور اس دھن میں ایک نہیں بلکہ کئی احادیث کو وضعی بتایا ہے۔ اور یہ خیال نہیں کیا کہ اس موقع پر عورتوں کے جہاد میں شامل ہونے اور حج کرنے کے ثواب کا مقابلہ تھا۔ حضورؐ نے ان کے لیے اگر حج کو بہترین عمل فرمایا ہے تو اس سے جہاد کی ضرورت میں کون سا نقص اور اس کی اہمیت میں کون سی کمی واقع ہوتی ہے۔ کہ برق صاحب نے اتنا تمسخر اور استہزا کیا ہے۔ علاوہ ازیں ایک شارع یا ایک مصلح جب اپنے پیروکاروں کو نیک اعمال کی ترغیب دیتا ہے۔ تو اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا۔ کہ کسی موقع پر کسی ایک عمل کی اہمیت واضح کرنے کے لیے اس پر خاص زور نہ دے۔ اور کسی دوسرے موقع پر کسی دوسرے نیک عمل کی اہمیت نہ جتلائے۔ نقص تو اس صورت میں متصور ہوگا۔ جب ایک موقع پر ایک عمل کو متروک بنایا جائے اور دوسرے کو بحال رکھا جائے۔ اور کسی اور وقت بحال کو متروک اور متروک کو بحال بنایا جائے۔ عام زندگی میں ہم اکثر ایک ہی مرتبہ کے دو نیک کاموں کو نیک تسلیم کرتے

---

[1] دو اسلام ص ۲۵۷

پڑتے کبھی ایک کی جانب زیادہ توجہ دیتے ہیں اور کبھی دوسرے کی جانب اس سے فوقیت والے کی پستی ہرگز ہرگز مقصود نہیں ہوتی۔ تاہم برق صاحب سے ہمارا یہ سوال ہے کہ آپ جہاد کو جب اتنا اہم تسلیم کرتے ہیں تو پھر گرمیوں میں تمام عالم اسلامی کے کیلنڈر سے ماہ رمضان کو خارج کرانے کے حق میں کیوں ہیں ؟

جواب ملتا ہے "چونکہ اسلام تمام زمانوں اور تمام انسانوں، اور تمام ملکوں کا مذہب ہے۔ اس لیے فدیہ کی رعایت مندرجہ ذیل لوگوں کے لیے ضروری ہے[1]

اوّل — ان ہزار ہا امیدواروں کے لیے جن کے امتحانات رمضان کے معاً بعد شروع ہو رہے ہوں۔ تاکہ وہ کماحقہٗ تیاری کر سکیں اور ناکام نہ ہو جائیں — آپ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ طلبہ ہی ملت کے معمار فردا ہوا کرتے ہیں۔ اور ان کی ناکامی قوم کو بمنازل پیچھے دھکیل دیتی ہے۔

دوم — ان باشندگان منطقہ ہائے حارہ کے لیے جن کے لیے روزہ ایک مصیبت بن جاتا ہے۔

سوم — ان انجن ڈرائیوروں کے لیے جو جون کی دوپہر کو سندھ اور بکر کے صحراؤں میں ٹرینیں لیے جا رہے ہوں۔

چہارم — ان مزدوروں کے لیے جو کوئلے پٹرول اور فولاد کے کارخانوں میں کام کر رہے ہوں۔ اگر یہ لوگ کام بند کر دیں۔ تو قوم کو کروڑوں

---

[1] اگرچہ یہ فہرست بہت طویل ہے۔ لیکن ہم قارئین کی اطلاع کیلئے اسے من وعن درج کرتے ہیں۔

روپیہ کا نقصان پہنچ جائے

پنجم — ان کسانوں کے لیے جو مئی اور جون کی لوؤں میں ہل چلانے پر مجبور ہوں۔

ششم — ان مزدوروں کے لیے جو گرمی کی دوپہر میں سڑک کھودنے اور بوجھ اٹھانے پر مامور ہوں۔

ہفتم — ان فوجیوں کے لیے جو سرحدوں پر متعین ہوں۔ اور جنہیں خطرہ ہو۔ کہ اگر روزے کی وجہ سے ذرا ڈھیلے پڑ گئے تو دشمن ہلہ بول دے گا۔[1]

ہشتم — ان ملازمین حکومت کے لیے جن کا روزہ انہیں سست بنا دیتا ہو۔ اور وہ کام نہ نکال سکتے ہوں۔ پنجاب سیکرٹریٹ کے ہر شعبے میں ہر روز سینکڑوں نئے اور اہم مسلوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اگر دس کلرک روزے کی وجہ سے سست ہو جائیں۔ تو ظاہر ہے کہ مسلوں کے انبار جمع ہو جائیں گے کام تقریباً رک جائے گا۔ اور حکومت بدنام ہو جائے گی۔[2]

نہم — ان معلمین کے لیے جو جماعت میں اس ڈر سے بولنا بند کر دیتے ہیں کہ کہیں گلے کی رگیں نہ خشک ہو جائیں اور پیاس نہ بڑھ جائے۔ ایسے معلم جہاں ترکِ فرائض کے مجرم بنتے ہیں۔ وہیں وہ طلبہ کو مہینہ بھر بیکار رکھ کر انہیں نقصان پہنچاتے ہیں۔

---

[1] مجاہدوں کو کتنا اچھا سبق دیا جا رہا ہے۔

[2] یہ کتاب ۱۹۴۹ء میں طبع ہوئی ہے۔ اسوقت کی حکومت کو کتنا عمدہ مشورہ دیا گیا ہے۔

دہم۔ ناروے۔ سکاٹ لینڈ۔ فن لینڈ اور سویڈن کے ان باشندوں کے لیے جن کے ہاں دن ۱۸ اور ۲۰ گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ وقس علی ھذا"[۱]

ہمارے خیال میں وہ گیارہواں نمبر میں اگر یوں اضافہ فرما دیتے کہ وہ وزیر اور سرکاری افسر جو سرکاری دورے پر ہوں۔ چونکہ ان کی تنخواہیں کم ہوتی ہیں اس لیے وہ دورے پر طعام و قیام کا خاطر خواہ انتظام نہیں کر سکتے۔ اور مملکت خداداد کے حریت پسند انہیں دعوت پر نہیں بلاتے۔ لہذا انہیں بھی روزہ نہ رکھنا چاہیے۔ اس طرح اس وقت کی حکومت کے وزرا پرق صاحب[۲] سے یقیناً خوش ہو جاتے۔ اس فہرست کی رو سے اگرچہ کوئی شخص باقی نہیں بچتا کہ جسے رعایت سے سرفراز نہ کیا ہو۔ اور یوں تمام پاکستانیوں کے خوش ہو جانے کا امکان بھی ہے۔ مگر ان کے خوش ہونے سے مجتہد العصر کو کیا فائدہ پہنچا ہو گا۔

اس کے بعد انہوں نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ انسان مال مشکل سے خرچ کیا کرتا ہے۔ اس لیے اگر ہماری حکومت اور رائے عامہ ہر مسلمان کو صوم یا فدیہ پر مجبور کر دے۔ تو روزہ خوروں کی بہت بڑی اکثریت نذر فدیہ سے بچنے کے لیے یا تو روزہ دار بن جائے گی۔ اور یا اسلام چھوڑ جائے گی...... جو لوگ نہ روزہ رکھیں۔ اور نہ فدیہ دینا چاہیں۔ بہتر ہے کہ اسلام چھوڑ کر سناتن دھرم اختیار فرمالیں"[۳]

۱۔ جہان نو ص ۲۹۹ - ۳۰۰ ۔ ۲۔ ہم برق صاحب کی تصانیف میں امن اور یا کی فصاحب کو نہیں سمجھ سکے۔ ۳۔ جہان نو ص ۳۰۲

سوامی دیانند بانی آریہ سماج نے مسلمانوں کو شدھ کرنے کی جو تحریک چلائی تھی۔ وہ اپنی موت آپ مر گئی تھی۔ اگر اس وقت انہیں برق صاحب ایسا کوئی اسلام کا دوست میسّر آجاتا تو جو دین سے بیزار ہوتے وہ کم از کم سنانتی تو ہو ہی جاتے۔ اس سے بھی سوامی جی کا دل خوش ہو جاتا۔

فرماتے ہیں میری اس تجویز کا مطلب مسلمانوں سے روزے چھڑوانا نہیں۔ بلکہ قرآن عظیم کے ایک بھولے ہوئے اہم حکم کو پھر زندہ کرنا ہے۔ اور صاف الفاظ میں اعلان کرنا ہے۔ کہ مسلمانوں پر دو میں ایک چیز فرض ہے۔ صوم یا فدیہ صوم" سلہ

ہو سکتا ہے کہ آپ کی نیت نیک ہو۔ مگر آپ کی مسیحا نفسی سے اسلام بہرہ ور نہ ہی ہو۔ تو اس کے لیے بہتر ہو گا۔ آپ کی تجویز مروجہ عبادت کو برباد کرنے کے لیے بہت زیادہ اُگتا رہی ہے۔ اور اس کے بدل میں آپ جو فدیہ کی وصولی کا خواب دکھا رہے ہیں۔ وہ کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکنے کا۔ لہذا ——— اس کا ایک نتیجہ واضح ہے۔ یعنی ترک صوم ——— کی ترغیب و تحریص۔

اب ہم پرویز صاحب کے ارشادات پیش کرتے ہیں ——— وہ طلوع اسلام میں روزہ کے احکام کے زیر عنوان لکھتے ہیں۔ (فروری ۶۲ء صفحہ ۱۷-۲۱)

"چونکہ رمضان المبارک کا مہینہ قریب آرہا ہے۔ اس لیے مناسب معلوم

سلہ ایضاً صفحہ ۳۰

ہوتا ہے کہ معمول کے مطابق، قرآن کی رُو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کر دیئے جائیں۔ یہ احکام سورہ بقر میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں۔

(۱) یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا۔ اسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے۔ تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو۔

(۲) اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ۔

یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں۔

(۳) فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ۔

پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

(۴) وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ ۝

اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں ان کیلئے روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔

(۵) فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

اس کے بعد بھی اگر کوئی اپنی خوشی سے زیادہ کرے تو مزید اجر کا موجب ہوگا - اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو تمہارے لیے روزہ رکھنا بہتر ہے -

(۶) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ......

روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے -

(۷) فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَ مَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ - $\frac{۲}{۱۸۳-۱۸۵}$

لہذا تم میں سے جو کوئی اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود[۱] ہو تو اسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں - البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے -

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ - ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ($\frac{۲}{۱۸۷}$)

---

[۱] گھر پر موجود ہونا کس لفظ سے نکلا، شہد اسے مراد دیکھنا یا پانا ہیں -

اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لیے صبح کی سفید دھاری سیاہ
دھاری سے متمیز ہو جائے۔ پھر رات تک روزہ پورا کرو۔

(۹) اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَۃَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ۔ (۲/۱۸۷)

اور تمہارے لیے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط
حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہو گیا کہ

(۱) روزے رمضان کے مہینے کے (تین دن یا نو دن کے نہیں بلکہ پورے
مہینے کے ہیں)

(۲) روزے میں اس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے،
دن کے ختم ہونے تک، کھانا پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

(۳) روزے اس کے لیے ہیں کہ جو اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو۔
اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی
پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی کو پورے کر دے۔

(۴) اب ایک شکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص
(عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے اور نہ مسافر ہے۔ لیکن کسی وجہ سے
اسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود
ہے۔ اور مریض بھی نہیں۔ لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے۔ کہ
بمشکل روزے رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ

وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں رکھ کر گنتی پوری کر دے۔ ایسے لوگوں کا حکم آیت نمبر۱۸۴ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں انھیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ وہ روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

غور فرمائیے۔ اوپر کی تینوں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہو گئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ کا ترجمہ —— وہ لوگ جو بد دشواری روزہ رکھ سکیں —— کیا ہے۔ حالانکہ اس کا عام ترجمہ —— اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں —— کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ اس ترجمہ کی رو سے مطلب یہ ہو گا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں حالانکہ قرآن کا منشا یہ نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ "طاقت" کا جو مفہوم ہمارے ہاں اردو میں رائج ہے۔ وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ عربی زبان میں اس لفظ کا کیا مفہوم ہوتا ہے —— اس کے لیے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔ محیط المحیط جلد دوم صفحہ ۱۳۰۴ میں ہے۔

طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں۔ لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں کہ جسے انسان بمشقت کر سکتا ہے۔ دراصل

یہ لفظ اس طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِہٖ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجا لانا ہمیں دشوار ہو۔

اسی طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب صفحہ ۲۳۰ جلد ۱۲ میں ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے۔ جو کسی انسان کے لیے بہ مشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہ اپنی تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵ جلد دو میں فرماتے ہیں کہ اِطَاقَۃٌ دراصل مُکْنَتٌ اور قُدْرَتٌ کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب اَطَاقَ الشَّیْءَ صرف اس وقت کہتے ہیں۔ جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو یعنی بدشواری اسے برداشت کر سکتا ہو چنانچہ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی اور وہ لوگ ہیں جو ان ہی کی طرح معذور ہیں یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے...... اسی بنا پر امام راغب نے لکھا ہے کہ :-

طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے۔ جس کا کرنا انسان کے لیے بہ مشقت ممکن ہو۔

اسی کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ

طَاقَۃٌ کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جا سکے۔ اور وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن کے لیے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت ثابت ہے، منسوخ نہیں ہے (تفسیر کشاف صفحہ ۲۵۵ جلد ۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ

عربی زبان میں اَلْوُسْعَ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو۔ اور طَاقَۃٌ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے۔ جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہذا (آیۂ زیرِ نظر) کے معنی یہ ہوں گے۔ اور ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے...... (روح المعانی صفحہ ۵۹ جلد ۲)

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ "طَاقَۃٌ" کا مفہوم کیا ہے اور اسی بناء پر وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کا ترجمہ — اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں — صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ — جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے امت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کر لے۔ چنانچہ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ میں بھی یہی اسلوب اجتماعی اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے۔ اور اس

کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں۔ اور ان پہ اب بھی غور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب "جامع احکام القرآن"، صفحہ ۲۶۸ - ۲۶۹ - جلد نمبر ۲ میں ہے کہ

تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں۔ ان کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے؟ چنانچہ ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے۔ اور حضرت انسؓ۔ ابن عباسؓ۔ قیس بن السائب اور ابو ہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرائے (حنفیہ) امام احمدؒ اور امام اسحاق کا قول بھی یہی ہے۔ نیز ابن عباس کی روایت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ام ولد سے فرمایا جو حاملہ تھی یا بچہ کو دودھ پلا رہی تھی کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو بہ مشقت روزے رکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا تیرے ذمہ فدیہ ہے قضاء نہیں ہے۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اور بھی وضاحت فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ

اَلَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَہٗ سے یہاں مراد بوڑھے، ضعیف اور

اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے زمرے میں شمار ہوں گے جو مزدور پیشہ ہوں جن کی معاش خدا نے پُر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لیے جاتے ہیں۔ اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو..... تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی وجہ سے جن کے دور ہو جانے کی کوئی امید نہ ہو۔ روزہ رکھنا گراں گزرتا ہو جیسے بڑھاپا۔ اور پیدائشی کمزوری۔ اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت۔ اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا سبب ہوتا رہتا ہے جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت، ان سب لوگوں کے لیے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلادیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔ (تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵-۱۵۷ جلد ۲)

ان تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتب ہو جاتی ہے۔

۱- بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت۔

۲- حاملہ عورتیں۔

۳- دودھ پلانے والی عورتیں۔

۴- اپاہج اور معذور لوگ۔

۵- پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی امید نہ رہے اور وہ ان کی

وجہ سے روزہ بمشقت رکھ سکیں۔

۶- ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر (الکمزور پیدا ہوئے ہوں۔

۷- وہ مزدور پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پر مشقت کاموں میں ہوتی ہے۔ مثلاً کانوں میں کام کرنے والے اور کارخانوں میں کام کرنے والے یا رکشہ چلانے والے۔

۸- وہ مجرم جن سے جیل میں مشقت کے کام لیے جاتے ہوں۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں۔ بحالات موجودہ، اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اصول یہی ہے کہ جو شخص بہ مشقت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے۔

یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآن کریم میں دیکھ لیں (یعنی سورۃ بقرہ۔ آیات ۱۸۳ تا ۱۸۸)"

اس مضمون میں آپ نمبر ۵ کا ترجمہ پرویز صاحب نے یہ کیا ہے کہ وہ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے زیادہ[۱] کرے تو مزید اجر کا موجب ہو گا۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو۔ تو تمہارے لیے روزہ رکھنا بہتر ہے۔"

برق صاحب نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے وہ اگر وہ زیادہ خیرات کرنا چاہیں تو ان کے لیے زیادہ اچھا ہے۔ اور بہتر تو یہی ہے کہ تم (فدیہ کی جگہ) روزے رکھو اگر صاحب علم ہو"

---

[۱] کیا زیادہ کرے؟ فروری ۱۹۶۰ کے رسالہ میں کرے لکھا ہے۔

پرویز صاحب نے یطیقونہٗ والی آیت کا (یہ) ترجمہ یوں کیا ہے:۔

" اور جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں۔ ان کے لیے روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے"۔

برق صاحب نے یطیقونہٗ والی آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے۔

" جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہیں (اور پھر نہیں رکھتے[۱]) وہ فدیہ ادا کریں۔ یعنی ہر روزہ کے عوض ایک غریب کو کھانا کھلائیں"[۲]

برق صاحب نے اپنے مسلک کو درست ثابت کرنے کے لیے بڑی تفصیل سے کام لیا ہے۔ اور ناسخ و منسوخ کی بحث میں بھی الجھے ہیں۔ اور نتیجہ جو نکالا ہے۔ وہ گذشتہ صفحات میں درج کتاب کیا گیا ہے۔ ان کے برعکس پرویز صاحب کے مضمون میں تفسیر کشاف کے حوالے سے تنسیخ سے متعلق صرف اتنا درج ہے۔ اس بنا پر یہ آیت ثابت ہے۔ منسوخ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں پرویز صاحب نے فدیہ کے تحت آنے والوں کی فہرست کو طول نہیں دیا۔ صرف ۸ قسمیں بتا کر یہ تحریر کیا ہے۔ کہ " بحالات موجودہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اصول یہی ہے کہ جو شخص بمشقت روزہ نہ رکھ سکے۔ وہ روزہ نہ رکھے۔" نیز وہ جس تفسیر کو زیادہ درست سمجھتے ہیں وہ مصر کے ایک عالم مفتی عبدہٗ کی ہے۔ اور برق صاحب نے اسی پسند کی سند بھی مصر ہی کے ایک فاضل شیخ الازہر علامہ جوہری

---

[۱] اس رکھنے سے کیا مراد ہے۔ مصلح صاحب! طاقت نہ رکھنا یا روزہ نہ رکھنا؟ [۲] جہان نو صـ ۲۷۸

طنطاوی کو عطا کی ہے۔ ان کی تفسیر جواہر القرآن کو اپنے مطلب کے موافق پایا ہے۔ اور یطیقونہ کا ترجمہ "طاقت رکھتے ہوں" کیا ہے۔ اور یہ نتیجہ نکالا ہے "لا یطیقون سے مراد صرف ضعیف اور سن رسیدہ بوڑھے ہیں۔ اور یطوقون سے وہ لوگ جنہیں روزہ تکلیف دیتا ہو۔ خواہ وہ جوان ہوں یا بوڑھے۔ چونکہ گرمیوں کا روزہ تقریباً ہر آدمی کے لیے تکلیف دہ ہے۔ اس لیے ہر آدمی فدیہ دے سکتا ہے۔" [1]

یہ نتیجہ پرویز صاحب کے مفہوم "جو لوگ بدشواری روزہ رکھ سکیں" کے برابر اور موافق ہے۔

آپ حیران تو ہوں گے کہ ان دو بزرگواروں کا نتیجہ ایک سا کیوں ہے؟ حالانکہ انہوں نے زیرِ بحث لفظ کا ترجمہ کرتے وقت جو روش اختیار کی تھی تو وہ مختلف تھی۔ علاوہ ازیں ان دونوں مصلحین نے مصر کے علماء کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اور وہ بھی جدید علماء کو۔ تفسیر کشاف کے حوالے ہیں۔ یاد رہے کہ اس لفظ کا مفہوم اتنا وسیع بیان نہیں ہوا جتنا کہ تفسیر المنار میں ہے۔ ملاحظہ ہو حوالہ کا صفحہ ۱۹۔ نیز برق صاحب کی فہرست، پرویز صاحب کی فہرست سے طویل کیوں ہے؟۔

ہم اس فرق تفسیر کی وضاحت کرتے ہیں:۔

۱۔ پرویز صاحب کی فہرست (فدیہ دینے والوں کی) اس لیے مختصر ہے کہ برق صاحب کی فہرست کی حماقت بادی النظر میں ہی ہر شخص پر عیاں ہے۔

---

[1] جہان نو ص ۲۹۸

انہوں نے ہر کسی کو اس رعایت کا مستحق قرار دیا ہے۔ لہذا پرویز صاحب نے بظاہر فہرست کو مختصر رکھا ہے کہ رعایت کی فراوانی کھٹکنے نہ پائے اور یوں اس تشریح سے روزہ ہی ایک تمسخر نہ دکھائی دے۔ انہوں نے اس فہرست کو یوں جامع کیا ہے۔ "وہ بحالات موجودہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے" بات وہی ہے۔ یعنی عام رعایت۔ مگر سلیقہ سے کی گئی ہے۔

۲۔ مصر کے علماء کا حوالہ اس لیے ہے کہ مصر میں جدید عصری اثرات کو بآسانی قبول کیا جا رہا ہے۔ اور وہاں کے علماء ماڈرن بننے میں تیز گامی سے برسرِ کار ہیں۔ وہ اپنی مملکت میں جو بے دینی پھیلا بیٹھے ہیں پاکستان میں نہیں پھیل سکی تھی۔ پرویز صاحب نے تفسیر کشاف کا ذکر محض برائے وزن بیت کے کیا ہے۔ آپ مضمون کا یہ حصہ بغور مطالعہ فرمائیں گے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ جیسے کشاف کی تفسیر سے وہ فہرست مرتب نہیں ہو سکتی۔ جو تفسیر المنار سے ہو رہی ہے

۳۔ نتیجہ کی یکسانی۔ جب انسان کسی لفظ کے معنی اپنی مرضی کے مطابق نکالنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے۔ ادھر ادھر سے بات کو کھینچ کر کبھی کسی محاورہ کی رو سے، کبھی کسی نئی تفسیر کی رو سے، کبھی کسی فنی اصطلاح کا سہارا لے کر، کبھی کسی جدید لغت کا حوالہ دے کر۔ کبھی سائنس کی کسی حقیقت کی عظمت بیان کر کے کبھی اپنی بنائی ہوئی کسی فطری صداقت کا رعب

سلہ بحالات موجودہ کے بعد اپنے اپنے حالات۔ کیا معنی۔ یہ ابہام کیوں

ڈال کر ـــــ اس کوشش میں بظاہر کامیاب ہو جایا کرتا ہے۔ برق صاحب بھی چھٹی کے خواہاں تھے۔ اور پرویز صاحب بھی۔ لہٰذا دونوں کا نتیجہ یکساں نہ ہوتا تو یہ چھٹی کیسے مل سکتی۔

پرویز صاحب لفظ طاقت سے نبرد آزما ہوئے ہیں۔ اور برق صاحب نے باب افعال کے جملہ خواص لکھ مارے ہیں۔ اور لفظ مذکور کو سلبی معنوں میں نا قبول کر کے ایجابی معنوں میں درست تسلیم کیا ہے۔ اور نتیجہ وہی۔ اس انداز میں پرویز صاحب کی روش اپنا مقصد نکالنے کی رو سے ان کے مقابلہ میں زیادہ دانشمندانہ ہے۔

لیکن آیت وَاِنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کا ترجمہ کرتے وقت برق صاحب نے فرمایا ہے۔ "اور بہتر تو یہی ہے کہ تم (فدیہ کی جگہ) روزے رکھو اگر صاحبِ علم ہو" [۱]

گویا تمام اٹکل پچو کے باوجود روزہ رکھنا فدیہ دینے سے بہتر ہی رہا۔

پرویز صاحب کو برق صاحب کی اس کمزوری کا علم تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے ـــ "اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو۔ تو تمہارے لیے روزہ رکھنا بہتر ہے۔ یہاں انہوں نے جس شے سے بہتر ہے۔ اس کا ذکر عملاً نہیں کیا۔ یعنی فدیہ کا۔ جس کا بیان ہو رہا تھا۔ یہ ابہام سہو سے نہیں ہے بلکہ دانستہ ہے۔ اس لیے کہ اس طرح عام تاثر یہ لیا جائے گا کہ اس آیت میں روزہ کے رکھنے کی بہتری مذکور ہے۔ حالانکہ فدیہ کے مقابلہ میں روزہ کی بہتری کا اظہار ہے۔ جیسے برق صاحب خطوط کے اندر لکھ کر واضح کر گئے۔ لیکن ان کے بڑے بھائی یہ "غلطی" نہیں کی ـــ

---

[۱] دو اسلام صفحہ ۲۷۹

صرف اس ایک ہی آیت کے پرویزی ترجمہ کو کسی منصف مزاج عالم کے سامنے پیش کرنے
پر اور اس کا فیصلہ سننے پر ان منکرین حدیث کے تخریبی پروگرام کا اندازہ لگایا جا سکتا
ہے۔ ملاحظہ ہو۔

" فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

اس کے بعد بھی اگر کوئی اپنی خوشی سے زیادہ کرے۔ تو مزید اجر کا موجب
ہو گا۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو۔ تو تمہارے لیے روزہ رکھنا بہتر ہے"

اس ترجمہ کے نصف آخر کو سر دست ملاحظہ فرمایئے۔ کہ پرویز صاحب نے
کتنی دیانت داری سے کام لیا ہے۔ ترجمہ یوں چاہیے تھا۔

ـ اور اگر تم روزہ رکھو تو تمہارے لیے اس میں خیر (بہتری) ہے اگر تم
سمجھ بوجھ رکھتے ہو ـــ

فدیہ کے ذکر کے ساتھ تعلمون کا بیان اور روزہ کا رکھنا خیر لکم ہونا۔
یہ تاثر پیدا کرتا ہے کہ فدیہ زیادہ سے زیادہ بوقت مجبوری ایک رخصت ہے اور اصل
خیر روزہ رکھنے ہی میں ہے۔ اس تاثر سے بچنے کے لیے پرویز صاحب "اگر تم سمجھ
بوجھ رکھتے ہو"، کو پہلے لے آتے ہیں اور "تو تمہارے لیے روزہ رکھنا بہتر ہے"
کو بعد میں رکھا ہے۔ کس لیے ـ؟ ـ اس مقصد کی خاطر کہ اس طرح صرف
روزہ رکھنے کی اچھائی روزہ کے جواز کی رو سے ظاہر ہو گی۔ اور فدیہ و روزہ کا
جو مقابلہ یہاں مقصود ہے۔ اور جس مقابلہ میں روزہ کو بہتر کہا گیا ہے۔ وہ قارئین
کی نظروں سے اوجھل رہے گا۔ اور یوں تو اپنا مقصد یعنی فدیہ کی عام اجازت اور آگے

چل کر ـــــ روزے سے چھٹی ـــــ حاصل کر سکیں گے ۔ انہیں اس دھن میں یہ خیال بھی یاد نہیں رہا کہ جن فدیہ دینے والوں کی فہرست مرتب کی جا رہی ہے ۔ ان میں سے اکثر اس قابل ہی نہیں ہیں کہ فدیہ دے سکیں ۔ مثلاً مزدور ، رکشا والے ، کان کن وغیرہ ۔ جو مزدور اس نصیحت پر عمل کر کے ایک روزہ نہ رکھے وہ تیس مساکین کو کھانا کہاں سے دے گا ۔ ؟ ۔

ہماری اس تنقید کی وضاحت برق صاحب کے متعلقہ ترجمہ کو ملاحظہ کر لینے سے ہو جاتی ہے ۔

یہ ہے ان بزرگواروں کی دیانت کا حال ۔ اور دعوےٰ یہ ہے کہ ہم حدیث کی صحت کے لیے قرآن کو مستند قرار دیتے ہیں ۔ اور جو لوگ ان کے عندیے سے آگاہ ہیں وہ صاحب انہیں منکرِ حدیث کہتے ہیں ۔ تو ان کی وہ گت بنائی جاتی ہے کہ الامان والحفیظ انہیں ملائے مکتبی کہا جاتا ہے ۔ ان پر تہمت تراشی جاتی ہے ۔ اس کے نادر نمونے نیاز صاحب فتح پوری اور برق صاحب کی تحریروں سے دیئے گئے ہیں ۔ پرویز صاحب کے ہاں اگرچہ اس جنس کی کم یابی ہے ۔ مگر ان کے مغ بچوں نے اس فنڈ میں بہت سرمایہ جمع کر رکھا ہے ۔ اور کمی کو پورا کر دیا ہے ۔

طلوع اسلام کے ایک رفیق عنایت اللہ صاحب نے "دھتکارے ہوئے انسان" کے عنوان سے پاکستان کے جیل خانوں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا ہے انداز بیان موثر اور واقعات کا انتخاب دلچسپ اور عبرت خیز ہے ۔ اس کتاب پر طلوع اسلام کے صفحات میں بہت عمدہ تبصرے کیے گئے ہیں ۔ اس کتاب کا مقصود اصلی یہ نہیں ہے کہ جیل خانوں کی اصلاح ہو جائے ۔ بلکہ مرکزی خیال کچھ اور

منکرینِ حدیث کا ایٹم بم

منکرینِ حدیث برق صاحب کی کتاب دو اسلام کو احادیث کے قلعہ پر ایٹم بم سے تشبیہ دیتے ہیں۔

"میں پھر کہتا ہوں۔ یہ ایک ایٹم بم ہے ——— ایٹم بم" ص۱۳۔ حرف اول کتاب مذکورہ۔

——— اس ایٹم بم کے باب ۱۹ کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ عنوان ہے۔ "چند دلچسپ احادیث" ان میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تمام حدیثیں وضعی ہیں۔ اور اپنے دعوے کو اسی دلیل پر منحصر رکھا ہے۔ کہ ان احادیث میں جدید سائنس کے مشاہدات اور حقائق علمیہ کا انکار موجود ہے۔

۱۔ سجدۂ آفتاب۔ ابوذرؓ کو حضورؐ نے فرمایا۔ کہ سورج بعد از غروب خدائی تخت (عرش) کے نیچے سجدے میں گر جاتا ہے۔ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ دیکھا آپ نے کسی جاہل حدیث تراش نے حضور علیہ السلام کے علم و دانش پر کتنا خوفناک حملہ کیا ہے۔ اگر ہم رات کے دس بجے پاکستان ریڈیو سے دنیا کو یہ حدیث سنائیں۔ اور کہیں کہ اس وقت سورج عرش کے نیچے سجدے میں پڑا ہوا ہے تو ساری مغربی دنیا کھلکھلا کر ہنس دے۔ اور وہاں کے تمام مسلمان اسلام چھوڑ جائیں"۔ ص۳۲۴

قطع نظر اس بحث سے کہ نبی کے لیے دنیا جہان کے تمام اکتسابی علوم کا جاننا ضروری بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ ہم بحث کی خاطر یہ تسلیم کر لیتے ہیں۔ کہ حضورؐ کے نام اسی لاعلمی کو منسوب کرنا درست نہیں ہے۔ لیکن کیا ابوذرؓ کا گردشِ زمین سے واقف نہ ہونا بھی کوئی نقص

اور عیب ہے۔ اگر نقص اور عیب ہے۔ تو ہم تم سب ان علوم اور حقائق سے واقف نہیں جو آج سے چھ ماہ بعد، سال بعد، سو سال دو سو سال بعد انسانی تحقیق کی حد سے روشنی میں آئیں گے۔ تو سب کے سب علم آفاق اور سائنس سے بے بہرہ ہونے کے ملزم ٹھہرتے ہیں۔ کیا یہ نظریہ منصفانہ اور عادلانہ ہے۔ آج جن باتوں کو پانچویں چھٹی جماعت کا ایک معمولی طالب علم جانتا ہے۔ ارسطو اور افلاطون ان میں سے اکثر سے بے خبر تھے۔ تو کیا ان کا علم ناقص تھا۔

اس حدیث کا مفہوم یہی ہے۔ کہ عرش عظیم کی عظمت اور خدا کے حکم کی وسعت اور طاقت ظاہر کرنی مقصود ہے۔ علم الاخلاق کے معلم کا کام موقع و محل سے فائدہ اٹھا کر اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دینا ہوتا ہے۔ برقی صاحب اگر اس بات پر غور فرماتے کہ عرشِ الٰہی کسی جگہ کو محدود اور متحیز نہیں ہے۔ کہ سورج کو اسکے نیچے کہنے سے زمین کی گردش محوری کی تردید ہو جائے گی۔ اللہ کا عرش اور اس کی کرسی ساری کائنات کو محیط ہے۔ لہذا سورج غروب نہ ہو کر بھی اس عرش کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ رہا مغربی دنیا سے ڈرنے کا سوال! اس کا علاج برقی صاحب! ہمارے پاس نہیں ہے ——

منکرین حدیث کو مغرب کی فکر بار بار ستاتی ہے —— معلوم نہیں کیوں —— !

شیطان کا طول و عرض:۔

"ابن عمر حضورؐ سے روایت کرتے ہیں کہ سورج نکلتے اور ڈوبتے وقت نماز نہ پڑھا کرو۔ اس لیے کہ سورج بوقت طلوع شیطان کے دو سینگوں میں پھنسا ہوا ہوتا ہے۔" ——

اس پر لکھا ہے۔ سورج کی موٹائی ساڑھے تین ارب میل ہے۔ اگر اتنی بڑی چیز شیطان

کے دو سینگوں میں سما جاتی ہے۔ اور ہم عرض کر چکے ہیں کہ پیشانی طول جسم کا سولھواں حصہ ہوتی ہے۔ تو شیطان کے جسم کی لمبائی پانچ کھرب بیس ارب میل ہونی چاہیے ...... زمین تقریباً گول ہے۔ اور زمین کے کسی نہ کسی حصے پر ہر وقت سورج طلوع ہوتا رہتا ہے۔ (تو اس طرح) سورج ہر وقت شیطان کے سینگوں میں پھنسا رہتا ہے۔ چونکہ ایسی حالت میں نماز ناجائز ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو نماز بالکل ترک کر دینی چاہیے۔ یہ ہے ہمارے ملّا کا مبلغ علم۔ .....» ص ۳۲۵۔

شیطان کے دو سینگوں سے مراد مجسم اور مادی سینگ نہیں ہیں۔ بلکہ اس وقت کو تعین اوقات صلوٰۃ کی رو سے قابلِ صلوٰۃ نہیں سمجھا گیا۔ صبح کی نماز کے وقت کا انضباط (طلوعِ آفتاب سے قبل تک ادائے نماز کا جواز) اس استعارے کی رو سے سمجھانا مقصود ہے۔ مثلاً کسی بہادر شخص کو اس کی صفت دلاوری کی رُو سے شیر کہنا ایک استعارہ ہے۔ مماثلت صرف بہادری اور بے خوفی میں ہے۔ گردن پر کے بالوں، دانتوں، پنجوں، کھال، گوشت خوری، درندگی، وحشت۔ اور چار پایہ ہونے میں نہیں ہے۔ اس طرح کنایہ، اور مجاز مرسل میں بھی وصفی معانی کسی قرینہ کی رو سے عین بین مراد نہیں ہوتے بلکہ مجازی معنی مراد ہوتے ہیں۔ اور ان کے بغیر ہمارا کاروبار گفتار ایک دن کے لیے بھی نہیں چل سکتا۔ مثلاً ہم کسی کے ہاں دو تین دفعہ ملنے کو جائیں اور اُسے نہ پا کر واپس آجائیں تو جب کبھی ملاقات ہو۔ تو اس سے یوں کہتے ہیں کہ بھائی عید کے چاند ہو گئے ہو۔ میں تمہارے ہاں پچاس دفعہ گیا۔ مگر تم نظر نہیں آئے۔ اس اندازِ گفتگو اور روزمرہ کے جواب میں وہ اگر یہ کہے کہ :-

ا۔ تم نے مجھے چاند بنا دیا۔ میرے دشمن ہو۔ چاند کی طرح مجھے گھٹنے بڑھنے

گے خواہاں ہو۔ چاند بہت بڑی شے ہے۔ جدید سائنس کی رو سے تم نے چاند پہ غور کیا ہوتا تو اس لاعلمی کا اظہار نہ کرتے اور مجھے چاند نہ کہتے۔

۲۔ تم جھوٹے ہو۔ کیا تم نے میرے ہاں حاضری کی تعداد کو اہتمام کے ساتھ گِنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم ۹۹ دفعہ آئے ہو۔ یا ۱۰۱ دفعہ —— بھئی تم حساب سے نہیں بتا سکتے۔ تو اندازہ لگاتے ہو گے —— لہٰذا تم اتنا حساب بھی نہیں جانتے جتنا کہ ایک دوسری جماعت کا بچہ بھی جانتا ہے۔

کیا یہ باتیں علم پروری کا نمونہ ہوں گی یا جہالت کا۔ اگر کسی سے کہا جائے کہ "میں تمہارے انتظار میں بیٹھا بیٹھا سوکھ گیا ہوں"۔ اور جواب یہ ملے۔ کہ جھوٹے ہو۔! تم تھیٹے گئے ہو۔ یا اس سوال پہ کہ "میں تمہارے فراق میں مر مٹا ہوں" کوئی منکر حدیث دلی یہ فرمائے کہ مرے ہوئے بھی بولا کرتے ہیں! —— تو اس اندازِ گفتگو کو تم ظریفی کہیں گے —— یا کچھ اور ——

برق صاحب نے خواہ مخواہ سورج کی موٹائی ناپی پیشانی اور سینگ کا تعلق سمجھایا۔ پیشانی اور جسم کی نسبت مقررہ کی —— استعارہ کو استعارہ رہنے دیتے تو کیا حرج تھا۔ مگر اعتراض کہاں سے جنم لیتا۔ ملا کا مبلغ علم کیسے دکھایا جاتا؟ —

حدیث کا علم الزلازل

لکھتے ہیں :-

"آپ شاید اس حقیقت سے بےخبر ہوں گے کہ زلزلے آسمانوں میں بھی آیا کرتے ہیں، اور اس زور سے کہ اللہ کا تخت تک کانپنے لگتا ہے۔" آنحضرت فرماتے ہیں۔ کہ سعد بن معاذ کی

موت پر خدائی تخت بھی کانپنے لگ گیا تھا (بخاری جلد ۲) سعد کی موت پر عرش بیک کیسے ہل گیا تھا۔ اسے سمجھنے کے لیے قیامت کا انتظار کیجئے۔"

ایٹم بم والے برق صاحب! سمجھئے سمجھ لیجئے — عرش کا ہلنا استعارہ ہے۔ جب عرش کو پہلے سے ٹھوس اور مادہ ثابت نہیں کیا جا رہا۔ تو اس کے ہلنے کو آسمانی زلزلہ بتانا انصاف سے بعید بات ہے۔ میر حسن نے شہزادہ بے نظیر کے یکایک غائب ہو جانے پر سحر البیان میں لکھا ہے :-

گلوں کا جگر درد سے پھٹ گیا ترانے سے بلبل کا جی ہٹ گیا

بندہ پرور! پھول کے ہاں جگر، دل، پھیپھڑے ثابت کرنے والا میر حسن کتنا نادان ہے۔ جدید علم نباتات سے قطعاً واقف نہیں۔ علامہ اقبال بھی جدید علوم سے واقف نہیں تھے۔ تب ہی تو انھوں نے فرمایا ہے :-

آسماں چیر گیا نالۂ بے باک مرا

اگر واقف ہوتے تو نہ آسمان کو ٹھوس قرار دیتے۔ اور نہ نالے کی رسائی کو اتنا طول دیتے۔ فضا کی وسعتوں کو چیرنے کے لیے تو کروڑوں نوری سال درکار ہیں۔ ان کا نالہ بے باک کیسے یہ مسافت طے کر گیا — فرمایئے — کیا یہ الزام درست ہے — ؟ -

حدیث کا علم النباتات

• مسجد نبوی میں ایک درخت تھا۔ جس کے پاس کھڑے ہو کر حضورؐ وعظ فرمایا کرتے تھے۔ پھر جب روز منبر تیار ہو گیا۔ اور آپ منبر پر چڑھ کر وعظ کہنے لگے۔ تو

اس درخت نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے نوحوں کی صدا اس اونٹنی کی طرح تھی۔ جس کا بچہ مر جائے۔ ہم یہ صدا سن رہے تھے۔ حضور منبر سے اترے۔ اس درخت پر ہاتھ پھیرا۔ اور وہ چپ ہو گیا۔" (روایت جابر بن عبد اللہ بخاری جلد ۲)

اس پر برق کا طنز یہ نشتر یوں چلتا ہے:۔

"حضور مکہ سے نکلے تو نہ ان کا گھر رو دیا۔ نہ کوئی درخت، نہ پتھر۔ آپ زندگی میں ہزار ہا درختوں کے نیچے بیٹھے ہوں گے۔ لیکن کوئی درخت کبھی نہ رویا۔ پھر اس مسجد والے درخت کو کیا خاص صدمہ پہنچا تھا۔ کہ وہ اونٹ کی طرح رونے لگا۔ حالانکہ حضور صرف دو قدم کے فاصلے پر موجود تھے۔ رونے کے لیے احساس، دل، دماغ، پھیپھڑوں، گلے اور رقیق نظام جسمانی کی ضرورت ہے۔ یہ سب کچھ اس درخت میں کہاں سے آگیا تھا۔ اگر آپ یہ کہیں کہ یہ معجزہ تھا۔ تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کو معجزہ دکھانے سے کیوں انکار کر دیا تھا۔ اور صاف صاف کہہ دیا تھا۔ ہَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ میں ایک انسان ہوں۔ جس کا کام اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔ نہ کہ معجزے دکھانا۔ اور مسلمانوں کے سامنے معجزہ دکھانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو پہلے ہی ایمان لا چکے تھے۔" ص ۲۳۷

اس حدیث کی تردید کرنے کے لیے جو عنوان قائم کیا ہے۔ وہ دوسرے گزشتہ عنوانات کی طرح دجل و فریب کا حامل ہے۔ معترض کو خود اس امر کا احساس ہے کہ یہ معجزہ تھا۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ معجزے وقوع پذیر نہیں ہو سکتے۔ اس کا صاف صاف اظہار نہیں کرنا چاہتے۔ مگر کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ ہندوستان میں انکار حدیث کی سب سے پہلی آواز سر سید مرحوم نے بلند کی تھی۔ وہ بھی معجزات کے شدید منکر

اور تاویل کے سمت شیدائی تھے۔ منکرین حدیث قرآن کو تو حجت مانتے ہیں۔ قرآن میں آیا ہے۔ موسیٰ وادی ایمن میں پہنچتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوسٰى ۝ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ۝ قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ۝ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ۝ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ۝ ۔ (طٰہٰ)

فرمایا۔ اسے موسیٰ اسے ڈال دے۔ پس جب موسیٰ نے عصا کو ڈال دیا۔ پھر وہ ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گیا۔ فرمایا اسے پکڑ لے۔ اور مت ڈر۔ ہم اسے اس کی سابقہ حالت پر لوٹا دیں گے۔ اور اپنا ہاتھ اپنی بغل سے لگا یہ سفید ہو جائے گا۔ بغیر کسی سقم کے۔ یہ ایک اور نشانی ہوگی۔ تاکہ ہم تجھے اپنی نشانیوں میں سے (کچھ) دکھاتے جائیں۔

عصا اژدہا ہو جانا۔ عام انسانی ہاتھ کا ید بیضا میں بدل جانا۔ اور پھر اژدہے کا عصا اور سفید ہاتھ کا اپنے معمول پر آ جانا ــــ معجزات نہیں تو اور کیا ہیں۔ اہل قرآن ہو کر قرآن کے اس واضح بیان سے انکار کرنا منکرین کو زیب نہیں دیتا۔

حدیث کا علم الاصوات :-

ابوہریرہ۔ رسول اللہ صلعم سے روایت کرتے ہیں۔ کہ جب تم مرغ کی صدا سنو تو اس سے فضل کی دعا مانگا کرو۔ اس لیے کہ اس وقت مرغ کو فرشتہ نظر آتا ہے۔ اور جب گدھے کی آواز سنو۔ تو شیطان سے پناہ مانگا کرو۔ اس لیے کہ وہ شیطان کو دیکھ کر ہینگتا ہے" ص ۱۳۳

اس پر یہ ریمارکس دیئے ہیں۔ حقیقت خرافات میں کھو گئی۔ اور یوں اس حدیث کو اپنے زعم میں غلط قرار دیا ہے۔ اگر کسی شخص کے دل میں ایمان ہو تو وہ۔ اس حدیث سے یہ سبق اخذ کر سکتا ہے۔ کہ ہادیٔ برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہدایت کی تعلیم دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مرغ کی اذان سے فضلِ الٰہی کی یاد دلا دی۔ گدھے کی آواز سے شیطان کے مکر و فریب سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں پناہ مانگنے کا خیال تازہ کر دیا۔ مگر ایک منکرِ حدیث کو یہ بات کیسے سوجھ سکتی ہے ــــ وہ اس حدیث کو سند مان کر حدیث کے علم الاصوات کو اس پر منحصر قرار دیتا ہے۔ اور تمسخر اڑاتا ہے۔ کیوں نہ ہو" اصلاح اور تبلیغ" کا کام اسی طرح چلا کرتا ہے۔

حدیث کا علم الالسنہ

" اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ سعدی نے گلستان سات زبانوں میں لکھی تھی۔ تو آپ کیا سمجھیں گے ؟ یہی کہ انہوں نے گلستان کے سات نسخے تیار کیے تھے۔ ایک فارسی میں دوسرا عربی میں، تیسرا انگریزی میں، چوتھا جرمنی میں، علیٰ ہذا القیاس۔ لیکن اگر کوئی شخص فارسی کے

گلستان کے متعلق یہ کہے کہ یہ سات زبانوں میں لکھی ہوئی ہے۔ تو آپ اسے یہی کہیں گے کہ سر پر ٹھنڈا پانی ڈال دو۔ تاکہ حواس درست ہو جائیں۔" ابن کعب کہتے ہیں کہ دو آدمیوں نے ایک ہی آیت کو مختلف طور پر پڑھا۔ اور مجھے کچھ اور طرح یاد تھی۔ ہم سب رسول اللہ صلعم کے پاس گئے۔ آپ نے فرمایا۔ کہ تم سب درست پڑھ رہے ہو۔ یہ سن کر مجھے اتنا صدمہ ہوا کہ میں اسلام چھوڑنے کو تیار ہو گیا۔ اس پر حضور نے فرمایا۔ کہ قرآن سات زبانوں میں اتارا گیا ہے"۔ مسلم جلد ۲ صہ ۳۶۲ کیا سات زبانوں میں اتارنے کا مفہوم یہ ہے کہ ایک ہی آیت سات مختلف زبانوں میں اتری تھی۔ تو پھر وہ باقی چھ زبانوں کے قرآن کہاں چلے گئے۔ اگر مراد یہ ہے کہ ایک آیت قریش کی زبان میں اترتی تھی۔ دوسری ہذیل کی، تیسری ازد کی زبان میں۔۔ تو پھر ایک ہی آیت کے متعلق ان تین صحابہ کی مختلف قراءتوں کو حضور نے درست کیوں قرار دیا۔ عام تجربہ تو یہی ہے کہ ایک مضمون کو ایک ہی فقرے میں ادا کیا جائے۔ تو اسے یاد کرنا آسان ہوتا ہے۔ لیکن یہ حدیث کچھ اور ہی بتاتی ہے۔ آنحضرت صلعم سے جبریل نے کہا کہ قرآن صرف ایک زبان میں پڑھا کرو۔ آپ نے فرمایا۔ کہ یہ چیز میری امت کی طاقت سے باہر ہے۔ جبریل آتا اور جاتا رہا۔ یہاں تک کہ ان دونوں کا سات زبانوں پر اتفاق ہو گیا، مسلم جلد ۲ صہ ۳۶۳ سبحان اللہ کیا منطق ہے۔ کہ ایک مضمون کے لیے ایک فقرہ یاد کرنا پڑے تو معاملہ امت کی طاقت سے باہر ہو جاتا ہے۔ اور اگر سات یاد کرنا پڑیں۔ تو بات آسان ہو جاتی ہے۔ ان محدثانہ رموز کو ہم تم کیا سمجھیں۔۔۔۔۔۔ کیا حضور کے اپنے نسخے میں ہر آیت سات سات زبانوں میں لکھی ہوئی تھی۔۔ اگر تھی تو صدیق و فاروق نے اس کی صحیح نقل ہم تک کیوں نہ پہنچائی۔ اگر نہیں تھی۔ تو اس حدیث کا مفہوم سمجھائیے

آیۂ وضو میں صرف ایک اختلاف کی بنا پر کہ کسی نے اَرْجُلَکُمْ کو اَرْجُلِکُمْ پڑھ دیا۔ پورا ایک فرقہ پیدا ہو گیا جو وضو میں پاؤں پر مسح کرتا ہے۔ اگر قرآن میں اس قسم کے اختلافات کی اجازت دے دی جائے۔ تو ہر مسلمان کا مذہب دوسرے سے جدا ہو جائے۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ اس حدیث کے تراشنے کا مقصد بھی مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنا اور قرآن کو ناقابلِ اعتماد بنانا ہے" ص ۳۳۳-۳۳۶

بندہ پرور! انتشار پیدا کرنا آپ کا اور آپ کے اماموں کا شیوہ ہے۔ اس حدیث نے امت پر بڑی مہربانی کی ہے۔ اور اختلاف کو مٹایا ہے ـــــ ناظرین! اس طویل اقتباس میں سے صرف خط کشیدہ تین الفاظ کو دوبارہ ملاحظہ کریں۔

تین صحابہ کی مختلف قراأتوں، زبانیں، زبانوں، قراأتوں کا لفظ خدائی تصرف کی بدولت برق صاحب کے قلم سے پھوٹ نکلا ہے۔ ورنہ انہوں نے یہ اہتمام فرمایا تھا کہ لفظ قراءت کی جگہ لفظِ زبان لکھ کر ان لوگوں کو دھوکا دیں۔ جو عربی سے ناواقف ہوں جنہیں حدیث کا متن دیکھنے اور سیاق سباق معلوم کرنے کی فرصت نہ ہو۔ قرآن سات زبانوں میں نہیں اُترا۔ بلکہ اس کی قراءت کی سات صورتیں درست اور جائز ہیں۔ اگر ایک ہی قراءت ہوتی تو حضورؐ کی قراءت (لہجہ و طریق ادائے الفاظ) کے علاوہ ہر قراءت ناجائز اور امت کے لیے دشواری کا باعث ہوتی۔ سات قراأتوں کی رو سے آسانی پیدا ہو گئی۔ اور قاری کے لیے مباح کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ آج کل قراءت کے مقابلے عام ہو رہے ہیں جب کوئی مقابلہ اس قسم کا ہو۔ تو وہاں حاضر ہو کر اختلاف قراءت کا منظر دیکھا جا سکتا ہے۔ زبان عربی ہی ہو گی۔ الفاظ وہی لغت عربی۔ لہجہ اور ادا کا فرق، قراءت کا فرق کہلائے گا۔

برق صاحب کو اس حدیث کی رو سے حدیث کا علم الاصوات نظر آنا چاہتے تھے۔ مگر نہیں آیا۔ کیا اس سے بڑھ کر دجل و فریب کی کوئی مثال اور ہو سکتی ہے! کیا سر پر ٹھنڈا پانی ڈالنے کا مشورہ برق صاحب کو بھی دیا جا سکتا ہے۔ یا کہ نہیں ـــ خدا کے بندو کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ کسی حدیث کو وضعی قرار دینے ..... اور اس کے "واضع" کو نشانہ طعن بنانے سے پہلے کم از کم اتنا تو سوچ لیا کرو کہ اگر وہ حدیث وضعی نہ ہو۔ اور آپ کی نا قدانہ بصیرت نے آپ کو دھوکا دے کر اسے آپ کے زعم میں وضعی بنا دیا ہو۔ تو آپ کے طعن کا نشتر کہاں جا پہنچے گا۔!

حدیث کا علم تولید:۔

اس موضوع پر برق صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جدید تحقیقات علم تولید میں جامع ہیں۔ اور حدیث کی فراہم کردہ معلومات ناقص ہیں۔ ان کی طرح چند اور بزرگواروں نے انہی احادیث کو عریاں قرار دیا ہے۔ مگر علم کے نقص کا الزام نہیں لگایا ـــ مولانا مودودی صاحب نے ان کے جواب میں جو کچھ لکھا ہے۔ ہم اسے کافی سمجھتے ہوئے یہاں نقل کر دیتے ہیں:۔

"تیسری حدیث میں ایک خاتون کو اس مسئلے سے سابقہ پیش آجاتا ہے کہ اگر ایک عورت اس طرح کا خواب دیکھے۔ جیسا کہ عام طور پر بالغ مرد دیکھا کرتے ہیں تو وہ کیا کرے۔ یہ صورت چونکہ عورتوں کو بہت کم پیش آتی ہے۔ اس لیے عورتیں اس کے شرعی حکم سے ناواقف تھیں۔ ان خاتون نے جا کر مسئلہ پوچھ لیا ـ اور حضورؐ نے یہ بتا کر۔ کہ عورت کو بھی مرد ہی کی طرح غسل کرنا چاہیئے۔ نہ صرف ان کو بلکہ تمام عورتوں کو ایک

تعلیم دے دی۔ اس پر اگر کسی کو اعتراض ہے تو گویا وہ یہ چاہتا ہے کہ عورتیں اپنی زندگی کے مسائل کسی سے نہ پوچھیں۔ اور شرم کے مارے خود ہی جو کچھ اپنی سمجھ میں آئے کرتی رہیں۔ یا حدیث کا دوسرا ٹکڑا تو اس میں ایک خاتون کے اظہار تعجب پر حضورؐ نے یہ علمی تحقیق بیان فرمائی ہے کہ عورت سے بھی اس طرح مادہ خارج ہوتا ہے۔ جس طرح مرد سے ہوتا ہے۔ اولاد ان دونوں کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور دونوں میں سے جس کا نطفہ بھی غالب رہتا ہے۔ بچے میں اسی کی خصوصیات زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ اس حدیث کی جو تفصیلات بخاری و مسلم کے مختلف ابواب میں آئی ہیں۔ ان کو ملا کر دیکھئے۔ ایک روایت میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں

وَ هل يكون الشبه الا من قبل ذالك اذا علا ماء ها ماء الرجل اشبه الولد اخواله وَاذا علا ماء الرجل ماء ها شبه الولد اعمامه

اور کیا اولاد کی مشابہت اس کے سوا کسی اور وجہ سے ہوتی ہے۔ جب عورت کا نطفہ مرد کے نطفے پر غالب رہتا ہے تو بچہ ننھیال پر جاتا ہے۔ اور جب مرد کا نطفہ اس کے نطفے پر غالب رہتا ہے۔ تو بچہ ددھیال پر جاتا ہے۔

منکرین حدیث نے جہالت یا شرارت سے ان احادیث کو یہ معنی پہنائے ہیں۔ کہ مجامعت میں اگر مرد کا انزال عورت سے پہلے ہو تو بچہ باپ پر جاتا ہے۔ ورنہ ماں پر۔" [۱]

اب آپ برقی صاحب کے ایٹم بم "دو اسلام" کے صفحات ۳۲۸۔۳۳۰ کو

---

[۱] ترجمان القرآن منصب رسالت نمبر۔ ص ۳۵۸

مطالعہ کریں۔ حقیقت اور افترا آپ پر روشن ہو جائیں گے۔

حدیث کا علم الآداب:۔

کے زیر عنوان رقمطراز ہیں:۔

"اگر کوئی شخص کسی محفل میں جا کر تین مرتبہ سلام کرے۔ اور ہر بات کو تین تین مرتبہ دہرائے تو آپ اسے کب برداشت کریں گے۔" انس کہتے ہیں کہ حضورؐ کی یہ عادت تھی کہ وہ تین مرتبہ سلام کہتے۔ اور ہر بات کو تین تین مرتبہ دہراتے تھے"۔ اس پر یدق صاحب نے حاشیہ آرائی کر کے اس طرز کو نیلامی کرنے والوں کا قاعدہ بتایا ہے حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ جس طرح ہر دانا معلّم کا کام ہوتا ہے کہ وہ اپنے زیر تعلیم افراد کو بات سمجھاتے وقت ہر ممکن کوشش اس امر کی کرتا ہے۔ کہ اپنا معانی الضمیر ان پر واضح کر سکے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اپنی تعلیمات عالیہ اور حکیمانہ ارشادات کو سمجھاتے وقت مخاطب افراد کی ذہنی صلاحیتوں کا لحاظ فرمایا کرتے تھے۔ اور اگر کسی موقع پر اعادہ ضروری ہوتا تو تین مرتبہ معانیے کو سمجھا دیا کرتے تھے۔ اسی طرح کسی موقع پر کوئی فرد یا مجمع حضورؐ کا سلام نہ سن پاتا۔ تو حضورؐ سلام تین مرتبہ کہتے۔ اور اسی کا اظہار انسؓ نے کیا ہے۔۔۔ فرمائیے کیا اعتراض ہے؟۔!

منکرین اعتراض کرتے وقت اس بات کا قطعاً خیال نہیں رکھتے۔ کہ ان کے اعتراض کی زد کس پر پڑتی ہے۔ انہیں تو اعتراض سے غرض ہوتی ہے ان کے لٹریچر سے یہ واضح ہے۔ کہ وہ اعتراض برائے اعتراض کرتے ہیں۔ لہذا انہیں ان کی غلطی پر تنبیہ کرنا سودمند نہیں ہو سکتا۔ البتہ اہل علم حضرات منکرین کے طریقِ کار سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔

لکھتے ہیں:۔

• ایک اور حدیث دیکھئے۔ • حذیفہ کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کھاد کے ڈھیر کے قریب آئے اور میرے سامنے کھڑے ہو کر پیشاب کیا۔" بخاری۔ جلد ا ص۳۶...

... بخاری ہی میں یہ جرأت تھی۔ کہ اس معلم کائنات و مہبط الوحی کی طرف یہ فعل منسوب کر دیا۔ ورنہ ہم تو حضور کے متعلق اس قسم کی کوئی بات خیال تک میں لانا گناہ سمجھتے ہیں• ص۳۳۳۔

برقی صاحب۔ سادہ لوحوں کو اس طرح دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ مگر جو لوگ آپ کے اور آپ کے ہم مشربوں کے انداز تحریر اور گستاخ لہجہ سے آشنا ہیں اُن پر آپ کے عشق رسولؐ کی حقیقت بھی واضح اور مبرہن ہے۔ آپ زبانی زبانی دعاگوئی کا دم بھرتے

ہیں۔ اور بخاری جان نثاری کرتا ہے۔ ؎

جان تم پر نثار کرتا ہوں　　　میں نہیں جانتا دعا کیا ہے!

اس حدیث میں کہاں مذکور ہے کہ حذیفہ نے حضورؐ کو ننگے بدن دیکھا۔ وہ تو حضورؐ کو کھڑے ہوئے دیکھتا ہے۔ یہ مشاہدہ دور کا بھی ہو سکتا ہے۔ اور نزدیک کا بھی۔ آپ نے دیکھنے کے اس مجرد فعل کو سامنے کے لفظ کی رو سے جو معنی پہنائے ہیں۔ "کوئی بات" ان سے پیدا ہوئی ہے۔ "کھاد کے ایک ڈھیر" کا وجود اس امر کے باور کر لینے کی گنجائش پیدا کر رہا ہے۔ کہ حضورؐ نے (مدت العمر میں) ایک دفعہ ڈھیر کی غلاظت سے اپنے جسم اور لباس کو بچانے کے لیے کسی ہنگامی مجبوری کے زیر اثر کسی اوٹ میں کھڑے ہو کر پیشاب کر لیا ہو گا۔ اس سے آپؐ کی ذات کے کمالات میں کوئی نقص نہیں پڑتا۔ بلکہ یہ واضح ہوتا ہے کہ آپ کو ہر حالت میں غلاظت سے بچنا مطلوب ہوتا تھا۔ اگر کھاد کے ڈھیر کے پاس بیٹھ کر پیشاب کرنا مذکور ہوتا تو "کوئی بات" آپ لوگ کھینچ تان کر نکال سکتے تھے۔

برق صاحب فرماتے ہیں:-

۱۰۰۔ حضورؐ نے حدیث لکھنے سے روک دیا تھا۔

عن ابی سعید الخدری قال قال رسول اللہ علیہ وسلم۔ لا تکتبوا عنی و من کتب عنی شیئا غیر القرآن فلیمحہ (صحیح مسلم)

ابی سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قرآن

کے بغیر میرا کوئی اور قول قلمبند نہ کرو۔ اور اگر کوئی شخص ایسا کوئی قول لکھ چکا ہو۔ تو اسے مٹا دے۔

آنحضرت صلعم نے کتابت احادیث سے منع فرمادیا تھا۔ اور جو چیز لکھی نہ جائے وہ لازماً پہلے بگڑتی ہے۔ اور بالآخر مٹ جاتی ہے۔ اور حضور کا مقصد بھی یہی تھا کہ قرآن حکیم کے بغیر کوئی اور کتاب ہدایت باقی نہ رہے" ؎۱

پیشتر اس کے کہ ہم برقی صاحب کی اس رائے کی تردید کریں۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ناظرین بالانصاف کے سامنے صحیح مسلم کی یہ حدیث صحیح الفاظ میں بیان کریں۔ تاکہ منکرین حدیث کی نیت کا فتور واضح ہو۔

عن ابی سعید الخدری ان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال لا تکتبو عنی غیر القرآن ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ وحدثوا عنی ولا حرج ومن کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار —

(صحیح مسلم کتاب الزہد باب التثبت فی الحدیث وحکم کتابۃ العلم ص۴۱۴ جلد دوم)

ابی سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ قرآن کے سوا میرا کوئی کلام تحریر میں نہ لاؤ۔ اور جس نے سابق میں ایسا کیا ہے۔ وہ اس تحریر کو مٹا دے۔ البتہ مجھ سے جو سنو اسے زبانی بیان کرو۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ اور جس کسی نے مجھ سے کوئی جھوٹی بات منسوب کی۔ وہ اپنا

؎۱ دو اسلام ص ۳۹-۴۱

ٹھکانا جہنم میں پائے گا۔

منکرینِ حدیث اس روایت کا دوسرا حصہ (یعنی روایت کی اجازت) بیان نہیں کرتے۔ اور یوں جدید تعلیم یافتہ حضرات کو دھوکا دیتے ہیں۔

اس کتمانِ حق سے ان کے مزاج کا حدود اربعہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ حضور کی اجازت سے صحابہ کرام کا احادیث کو لکھنا بدرجہ تواتر ثابت ہے۔ اور فقط اجازت ہی نہیں بلکہ کتابتِ حدیث کا حکم بھی ثابت ہے۔ حضور نے اپنے طور پر خاص اہتمام سے قرآن کریم کی کتابت کا فرمایا۔ البتہ جن لوگوں نے از خود حدیث کی کتابت کی اجازت چاہی ان کو اجازت دی۔ اور خاص خاص موقعوں پر خود بھی خاص خاص احکام اور خطبوں کے تحریر کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ کتابت حدیث کا مستحسن ہونا واضح ہو۔ ممانعت کتابت کا حکم پہلے کا ہے۔ اور اجازت کا حکم اس کے بعد کا ہے۔ ممانعت وقتی مصلحت سے تھی۔ مگر منکرین ہیں کہ اس حدیث کے نصف حصہ کو اچھال رہے ہیں۔ اور بقیہ نصف کو چھپا رہے ہیں۔ اور اس باب کی دوسری حدیث کا ذکر تک نہیں کرتے۔ جب ان کا اپنا مزاج ایسا ہے۔ تب دوسروں کو ثقہ نہیں سمجھتے۔

۲۔ علامہ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں۔ کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی نے پانچ سو احادیث کا ایک مجموعہ تیار کیا ہوا تھا۔ (ظاہر ہے کہ حضرت صدیق کے مجموعے سے زیادہ قابلِ اعتماد اور کون سا مجموعہ ہو سکتا تھا) لیکن پھر اٹھ کر اسے جلا دیا۔[1]

برق صاحب نے یہاں بھی فریب دینے کی کوشش کی ہے۔ اس روایت کا

---

[1] دیباچہ ص۲۲

یہ مذکور ہے کہ حضرت صدیق رضؓ نے فرمایا۔ کہ مجھے اس مجموعہ پر اطمینان نہیں۔ گویا یہ جلانا عدم اطمینان کی وجہ سے تھا۔ اس بنا پر نہیں تھا کہ حضرت صدیق رضؓ حدیث نبوی کو حجت نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ ستم تو یہ ہے کہ برق صاحب نے جس صاحب کی کتاب سے یہ حوالہ نقل فرمایا ہے۔ (یعنی حافظ ذہبی) ۔ انہوں نے تذکرۃ الحفاظ ص۵ جلد اول میں حضرت ابوبکرؓ کے اس واقعہ کو نقل کر کے صاف لکھ دیا ہے کہ لا یصح ذلک۔ یہ روایت صحیح نہیں۔ برق صاحب غیر معتبر روایت کو تو نقل کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کے متصل یہ الفاظ کھا جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد دوسری روایات جو حدیث کی قبولیت سے متعلق ہیں نظر انداز کر جاتے ہیں۔ کیا یہ دیانت ہے ؟

۳۔ " جب حضرت صدیق مسند خلافت پر جلوہ آرا ہوئے تو آپ نے ایک دن مجمع عام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔ تم لوگ آج احادیث میں اختلاف رکھتے ہو۔ آئندہ یہ اختلاف بڑھتا جائے گا۔ اس لیے تم آنحضرت سے کوئی حدیث روایت نہ کرو۔ اور اگر کوئی پوچھے تو کہو کہ ہمارے پاس قرآن موجود ہے۔ جو اس نے جائز قرار دیا ہے۔ اسے جائز اور جسے ناجائز قرار دیا ہے۔ اسے ناجائز سمجھو۔" (تذکرۃ الحفاظ ذہبی ص۳)

۴۔ " علامہ ذہبی لکھتے ہیں۔ کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ ابن ابی کعب جیسے جلیل القدر صحابی کو روایت احادیث کی بنا پر پیٹنے پر تل گئے تھے۔ اور اسی جرم میں حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابو ذر، اور حضرت ابو الدرداء جیسے عظیم المرتبت اصحاب کو قید کر دیا تھا۔ تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص۔ ابن الخطاب کو یہ سزا اس لیے نہیں دی ہوگی۔ کہ وہ لوگوں کو صحیح

احادیث سنایا کرتے تھے۔ بلکہ اس لیے کہ وہ صحیح و غلط میں امتیاز نہیں کر سکتے ہونگے۔"

برق صاحب نے فاروقِ اعظمؓ پر الزام تراشی کرتے ہوئے ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ ڈاکٹر شیخ مصطفٰے حسنی سباعی کی کتاب سنت رسولؐ سے ہم اس موضوع پہ چند حوالے پیش کرتے ہیں۔

لکھتے ہیں :-

"کیا حضرت عمرؓ نے کثرت روایت کی بنا پر کسی صحابی کو قید کیا تھا ؟

مشہور ہے۔ کہ حضرت عمرؓ نے کبار صحابہ میں سے تین اصحاب یعنی حضرت ابن مسعودؓ ابو درداؓ اور ابو ذر غفاریؓ کو کثرت روایت کی بنا پر قید کیا تھا۔ میں نے کوشش کی ہے۔ کہ کسی معتبر کتاب میں مجھے یہ روایت مل جائے۔ لیکن میں ناکام رہا ہوں۔ اس روایت کا موضوع ہونا واضح ہے۔ ابن مسعود ایک جلیل القدر صحابی اور سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے دل میں ان کی بڑی وقعت تھی۔ حتیٰ کہ جب ابن مسعودؓ کو انہوں نے عراق بھیجا۔ تو اس فعل کا اہلِ عراق پہ بطورِ ایک احسان کے ذکر کیا۔ اور ان سے کہا۔ میں عبداللہ بن مسعود کو اپنے پاس رکھنے کی بجائے تمہارے پاس بھیجنے میں بڑے ایثار سے کام لے رہا ہوں۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ابنِ مسعودؓ کا قیام عراق میں رہا۔ ان کو حضرت عمرؓ نے بھیجا ہی اس لیے تھا کہ اہل عراق کو احکام کتاب و سنت سکھائیں۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انہیں کثرت روایت کی وجہ سے قید کیا گیا ہو ؟ جہاں تک ابو ذرؓ اور ابو درداؓ کا تعلق ہے۔ ان دونوں اصحاب سے اتنی احادیث مروی ہی نہیں ہیں کہ انہیں مکثرین میں شمار کیا جا سکے۔ علاوہ ازیں ابو درداؓ بھی ابن مسعود کی طرح شام میں مسلمانوں کے معلم تھے۔ اور جو سوال آخر الذکر کے بارے

۱؎ ایضاً صـ۵

پیدا ہوتا ہے۔ وہی اولی الذکر کے بارے میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ کیا حضرت عمرؓ یہ چاہتے تھے کہ یہ دونوں حضرات روایت حدیث سے اجتناب کریں۔ تاکہ دین کے احکام مخفی رہ جائیں؟ حضرت ابوذر سے جو احادیث منقول ہیں وہ حضرت ابوہریرہ کی روایت کردہ احادیث کا ایک معمولی جزو بنتی ہیں۔ تو پھر اگر ابوذرؓ کو محبوس کیا گیا تھا۔ تو حضرت ابوہریرہؓ کو قید کرنا کہیں زیادہ ضروری تھا۔ اگر یہ کہا جائے۔ کہ حضرت ابوہریرہ حضرت عمرؓ کے ڈر سے روایت نہیں کرتے تھے۔ اس لیے انہیں قید نہیں کیا گیا۔ تو پھر حضرت ابوذر کو حضرت عمرؓ کا خوف کیوں نہیں تھا؟ صحابہ کرامؓ میں سے حضرت ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ، ابوہریرہؓ، جابر ابن عبداللہؓ اور حضرت عائشہؓ کو کثیر الروایت تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر ان میں سے کسی ایک کی طرف سے بھی کوئی ایسی بات منقول نہیں ہے۔ جس سے معلوم ہو کہ حضرت عمرؓ ان کو روایت سے روکتے تھے۔ بلکہ حضرت عمرؓ سے یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ جب حضرت ابوہریرہؓ نے لوگوں سے کثرت سے احادیث بیان کرنا شروع کر دیں۔ تو حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ ان سے کہا آپ فلاں مقام پر موجود تھے جب کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ تھے۔ انہوں نے جواب دیا۔ ہاں —— اور میں نے آپ سے یہ سنا تھا۔ کہ جس نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ منسوب کیا۔ اس نے آگ میں اپنا ٹھکانا بنا لیا —— حضرت عمرؓ نے کہا۔ اگر آپ کو یہ فرمانِ رسولؐ یاد ہے۔ تو پھر جائیے اور روایت کیجئے۔

اب یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ کہ حضرت ابوہریرہ کو چھوڑ دیا گیا ہو۔ جو کثرت روایت میں جملہ صحابہ پر فوقیت رکھتے تھے۔ اور ابن مسعودؓ اور ابو الدرداؓ جیسے صحابہ کو قید کر دیا گیا ہو۔ جن سے ابوہریرہؓ کی بہ نسبت بہت کم روایات منقول ہیں۔

میں نے اس روایت پر بہت غور کیا۔ اسے مختلف طریقوں سے جانچا۔ حتیٰ کہ ابن حزم کی کتاب الاحکام جلد ۲۔ صفحہ ۱۳۹ میں اس پر تنقید میری نگاہ سے گزری۔

حضرت عمر کے متعلق کہا گیا ہے کہ انہوں نے ابن مسعودؓ، ابوالدرداءؓ اور ابوذرؓ کو بہ بنائے اکثار حدیث قید کیا تھا۔ یہ روایت انقطاع سے مطعون ہے۔ کیونکہ اس کے راوی ابراہیم بن عبدالرحمٰن بن عوف کا حضرت عمرؓ سے سننا ثابت نہیں۔ امام بیہقی نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا ہے۔ اگرچہ یعقوب ابن شیبہ اور طبری وغیرہ نے سماع کو ثابت کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سماع ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ راوی ننانوے یا پچانوے سن ہجری میں فوت ہوئے۔ ان کی عمر پچھتر برس کی تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش اواخر خلافت عمرؓ میں ۲۰ھ میں ہوئی۔ اس طرح حضرت عمرؓ سے ان کے سماع کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس بنا پر یہ روایت حجت و دلیل نہیں بن سکتی۔ آگے چل کر ابن حزم لکھتے ہیں کہ یہ روایت بذاتہٖ بھی کذب اور اختراع کا ایک نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے ایک طرف تو صحابہ کرام پر اتہام کذب ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ ایک نہایت سنگین بات ہے۔ اور دوسری طرف اس سے حضرت عمرؓ کا تبلیغ سنت سے کبار صحابہ کو روکنا اور احکام دین کا اخفاء و انکار لازم آتا ہے۔ جو اسلام سے خروج کے مترادف ہے۔ معاذ اللہ! امیر المومنین یہ کیسے کر سکتے تھے یہ بات کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں ہو سکتی۔ اور اگر اصحاب ثلاثہ مذکورہ پر اس سلسلے میں غلط بیانی کا اتہام نہ تھا۔ تو پھر انہیں نظر بند کرنا صریح ظلم کی تعریف میں آتا ہے۔ بہر حال یہ فاسد روایت ہرگز قابلِ قبول نہیں ہے۔ کیونکہ اسے مان لینے کے بعد دو ضلالت آمیز مفروضوں میں سے کسی ایک کو تسلیم کرنا ناگزیر

ہو جاتا ہے۔" سلہ

منکرین حدیث کو کسی تحقیق کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ مسلّمہ اور مصدقہ باتوں کو شک و شبہ کے حوالے کرنے کے لیے ہر قسم کی قطع و برید کو روا رکھتے ہیں۔

برق صاحب لکھتے ہیں:۔

۵۔" حضرت عمرؓ ابوہریرہ کو کیوں پیٹ ڈالتے ۔۔۔ سرور کائنات کا اسوہ بیان کرنے پر کیا کوئی مسلمان ایسا کر سکتا ہے! نہیں۔ بلکہ مشتبہ غلط اور محرّف احادیث کی روایت پر۔ عمر اسی لیے تو احادیث جلا دیا کرتے تھے۔ اور بڑے بڑے صحابہ کو اس جرم میں قید و بند کی سزا دیتے تھے۔ جب عمرؓ نے ابوہریرہ کو حضور پُر نور کی زندگی میں سب کے سامنے پیٹ ڈالا تھا اور جس نے رسول اکرم صلعم کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کہہ دیا تھا۔ حسبنا کتاب اللہ وہ عمر اپنے عہد خلافت میں ابوہریرہ یا کسی اور بزرگ کو روایت احادیث کی اجازت کیسے دے سکتا تھا!۔" سلہ

حضرت فاروقؓ پر تہمت تراشنے میں منکرین حدیث اس لیے زیادہ بے باک واقع ہوئے ہیں کہ ان کے نزدیک حفظ مراتب کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔

برق صاحب حضرت عمرؓ کا ذکر ایسے کر رہے ہیں جیسے کوئی اپنے ہم پایہ کسی ہم عصر کا کیا کرتا ہے۔

۱۲۔ ایک مرتبہ کاتب الوحی حضرت زید بن ثابت، معاویہ کے دربار میں گئے۔ امیر نے احادیث کی فرمائش کی۔ آپ نے چند احادیث سنائیں اور منشی دربار ساتھ

سلہ سنت رسول (ترجمہ) صفحہ ۵۴ سلہ دو اسلام صفحہ ۵۸

ساتھ لکھتا گیا۔ آپ نے وہ کاغذ لے کر چیر ڈالا۔ اور فرمایا رسول اللہؐ نے احادیث لکھنے سے منع فرمایا ہے۔" بیان العلم ص۳۲ ۔ [1]

برق صاحب نے اس سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اس دور میں احادیث کی کتابت بالکل نہیں ہو سکی۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ دوسرا تاثر یہ پیدا کرنا چاہا ہے۔ کہ صحابہ کرام حدیث کو اتنی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ حالانکہ یہ برق صاحب کی غلط فہمی ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ بعض صحابہ کرام زبانی روایت کو پسند کرتے تھے۔ اور جس طرح انہوں نے سنا تھا۔ اس طرح دوسروں تک پہنچانا ان کے نزدیک باعث برکت تھا۔

۷۔ "علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابوموسیٰؓ عمر فاروقؓ کے مکان پر گئے۔ تین آوازیں دیں۔ اور واپس چل دئے۔ حضرت فاروقؓ باہر نکلے۔ واپس جانے کا سبب پوچھا تو کہا۔ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ گھر پر تین آوازیں دو اگر صاحب خانہ نہ بولے تو لوٹ جاؤ۔ عمرؓ نے کہا اس حدیث پر فوراً شہادت پیش کرو۔ ورنہ میں تمہیں سزا دوں گا۔ وہ گھبرائے ہوئے مسجد نبوی میں پہنچے۔ اور خوش قسمتی سے انہیں شہادت مل گئی۔ ورنہ پٹ جاتے۔ تذکرہ جلد ا ص۶" [2]

افسوس صد افسوس۔ برق صاحب نہایت قبیح بددیانتی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اسی واقعہ کے بیان کے بعد وہ اسی مصنف کا تبصرہ کیوں نہیں بیان فرماتے۔ حافظ ذہبی ابوموسیٰؓ کے اس واقعہ کے بعد اس روایت پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:۔

"حضرت عمرؓ کا منشا یہ تھا کہ ابوموسیٰ اشعری کی حدیث کسی دوسرے صحابی کی روایت سے مل کر خوب محکم اور پختہ ہو جائے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب کسی حدیث کو

---

[1] ایضاً ص۵۳ [2] ایضاً ص۵۴ ۔

دو ثقہ راوی روایت کریں۔ تو وہ حدیث اس حدیث سے زیادہ قوی اور راجح ہوتی ہے کہ جس کو فقط ایک راوی روایت کرے۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کا مقصود یہ تھا کہ لوگوں کو روایت حدیث میں اس طرح مائل کریں کہ جس قدر ممکن ہو۔ حدیث کے طرق کیثرہ در اسانید متعددہ کو جمع کریں۔ تاکہ روایت درجہ ظن سے ترقی کر کے درجہ علم تک پہنچ جائے۔ اس لیے کہ ایک شخص پر وہم اور نسیان ممکن ہے۔ مگر ایسے دو ثقہ آدمی کہ کوئی ان کی مخالفت اور تردید نہ کرے۔ ان پر خطا اور وہم کا احتمال عادتاً بہت مستبعد ہے نیز حضرت عمرؓ اس سے غایت درجہ خائف رہتے تھے۔ کہ کوئی صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ کر دے۔ اس لیے صحابہ کو حکم دیتے تھے۔ کہ جہاں تک ممکن ہو۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے کم روایت کیا کریں۔ نیز حضرت عمرؓ کو یہ بھی اندیشہ تھا۔ کہ لوگ روایت حدیث میں اتنے مشغول ہو جائیں۔ کہ قرآن سے غافل ہو جائیں۔" تذکرۃ الحفاظ ص۶ جلد اول۔

برق صاحب! خدا کا خوف کیجئے۔ مطبوعہ کتابوں سے غلط حوالے دینا دلیری تو ہو سکتی ہے مگر انصاف نہیں جس روایت سے کہ احادیث کے ضبط کرنے میں احتیاط ثابت ہوتی ہے۔ اس سے برق صاحب احادیث کے غیر ضروری ہونے پہ استدلال پیدا کر رہے ہیں۔

قرظہ بن کعب کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم عراق کو روانہ ہوئے۔ حضرت فاروق اعظمؓ مقام صرار تک ہمارے ساتھ آئے۔ وہاں نماز ادا کی۔ اور پھر فرمایا۔ کہ دیکھو میں ایک نہایت اہم بات کہنے کے لیے تمہارے ہمراہ یہاں تک آیا ہوں۔ اور وہ یہ کہ عراق کی سرزمین سے تلاوت قرآن کی رسیلی آوازیں اٹھ رہی ہے۔ جس طرح چھتے

کے ارد گرد شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں ۔۔ خدا کے لیے انہیں احادیث میں پھنسا کر قرآن سے دور نہ پھینکنا۔ (تذکرۃ الحفاظ ص۳) ۔ لہ

برق صاحب نے اپنے پیر بھائیوں کی طرح عربی کی عبارت نقل کرتے وقت بھی الفاظ کو بحال نہیں رکھا۔ اور ترجمہ کرتے وقت بھی دیانت کا ثبوت نہیں دیا۔ اور جو ایک آدھ قول کسی کتاب سے نقل کیا ہے۔ اس کتاب کے موضوع سے انصاف نہیں کیا۔ اور اقتباس کے ماسبق وما بعد کا لحاظ نہیں رکھا ہے۔ اتہام تراشی میں دلیری سے کام لیا ہے۔ مطالب کو توڑنے اور مروڑنے میں یدطولیٰ کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ ان لوگوں کو جو حدیث کے علم سے واقف نہیں گمراہ کیا جاسکے۔

منکرین حدیث کو بعض صحیح مزاج اور انصاف پسند علماء کے ہاں سے بھی اپنے مطالب کا مواد میسر آجاتا ہے ۔۔۔ مثلاً

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں :-

" جو احکام اور واقعات پیش آتے تھے۔ ان میں بھی روایت کا سلسلہ کم جاری ہوا تھا۔ صحابہ خود رسول اللہ (صلعم) سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ اور واسطہ وروایت کی کم ضرورت پڑتی تھی۔ حدیثوں کے قلمبند کرنے کی اجازت نہ تھی۔ صحیح مسلم میں روایت ہے کہ لا تکتبوا عنی شیئاً غیر القرآن ومن کتب عنی شیئاً غیر القرآن فلیمحہ ۔ رسول اللہ (صلعم) کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی خلافت شروع ہوئی۔ ابتدا ہی میں عرب کی بغاوتِ عام کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس سے فارغ ہو کر روم و ایران کی مہمیں شروع ہو گئیں۔ اور ان کی مختصر خلافت میں حدیثوں کی چنداں اشاعت نہ ہو سکی۔ حضرت عمرؓ نے سات برس خلافت کی۔ اور ملک میں نہایت امن امان رہا۔ لیکن وہ

لہ ایضاً ص۳

دانستہ حدیثوں کی کثرت کو روکتے رہے۔ علامہ ذہبی نے طبقات الحفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ اس خوف سے کہ حدیث بیان کرنے والا رسول اللہ کی طرف غلط روایت منسوب نہ کر دے۔ صحابہ کو ہمیشہ حکم دیتے تھے۔ کہ حدیثیں کم بیان کیا کریں۔ ایک بار انصار کے ایک گروہ کو کوفہ بھیجا۔ چلتے وقت ان سے فرمایا۔ کہ تم لوگ کوفہ جارہے ہو۔ وہاں ایک قوم سے ملوگے جو بڑی رقت سے قرآن تلاوت کرتے ہیں۔ وہ تمہاری آمد سن کر مشتاق ہوں گے کہ رسول اللہ (صلعم) کے اصحاب آئے ہیں۔ لیکن جب وہ تمہارے پاس آئیں۔ اور حدیثیں سننی چاہیں تو زیادہ حدیثیں نہ بیان کرنا۔ اسی طرح عراق کو صحابہ جانے لگے۔ تو حضرت عمرؓ نے خود ان کی مشایعت کی اور ان سے پوچھا کہ جانتے ہو میں کیوں تمہارے ساتھ آرہا ہوں۔ لوگوں نے کہا فکرمۃ علینا۔ یعنی ہماری عزت افزائی کے لیے۔ فرمایا کہ ہاں۔ لیکن ایک اور مقصد ہے۔ وہ یہ کہ جہاں جارہے ہو۔ وہاں کے لوگ اکثر قرآن تلاوت کیا کرتے ہیں۔ ان کو حدیثوں میں نہ پھنسا لینا۔ اور رسول اللہ (صلعم) سے کم روایت کرنا" [1]

مولانا شبلیؒ ایسے جید اور معاملہ فہم فاضل سے نہ معلوم کس طرح یہ سہو ہو گیا۔ کہ انہوں نے مسلم محولہ بالا حدیث کو تمامہ بیان نہیں کیا۔ اور ان کے رفیق اکبر سر سید مرحوم کے مریدانِ باصفا نے ان کی اس توجیہ یعنی کتابت کی عدم اجازت کو قبول کر کے اپنا اُتو سیدھا کیا ہے۔ اور حضرت عمرؓ پر یہ تہمت تراشی ہے کہ وہ روایت حدیث سے منع فرماتے تھے۔ حالانکہ مولانا شبلیؒ کے اس حوالے سے اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ عمرؓ فاروق

[1] سیرۃ النعمان صفحہ ۱۸۸-۱۸۹ ۔ اسکے ساتھ کا حصہ یہ ہے کہ ڈرانا شعر یکلکوم، اور میں قلت روایت میں تمہارا شریک ہوں۔ یعنی کم روایت کرتا ہوں۔ روایت کرنا جرم ہوتا تو قلت بھی جرم کے تحت آتی ہے۔

روایت کی کثرت کو پسند نہیں کرتے تھے۔

لیکن منکرین حدیث اس احتیاط کو مخالفت قرار دیتے ہیں۔ اگر کوئی حکومت اپنی زرعی پالیسی کے پیش نظر کسی وقت یہ اعلان کرے کہ کاشتکاروں کو ہدایت کی جاتی ہے۔ کہ وہ اپنی زمینوں میں چنے کم کاشت کریں۔ اور گندم پر زیادہ زور دیں۔ تو اس اعلان کا یہ مقصد قطعاً نہیں ہو سکتا۔ کہ چنے بونا جرم ہے۔ نہ ہی کسی ایسے کاشتکار کو کوئی قاضی سزا دے سکتا ہے۔ لیکن منکرین حدیث ہیں کہ احتیاط اور امتناع میں فرق نہیں کرتے۔ حضرات شیخین کثرت روایت میں غلطی کے اندیشہ سے احتیاط کا مشورہ دیتے تھے۔

ابن ابی ملیکہ کی مرسل روایت میں ہے کہ ابوبکر صدیقؓ نے حضورؐ کی رحلت کے بعد صحابہ کو جمع کر کے کہا۔ کہ تم اب رسول اللہ کی حدیثیں بیان کرو گے۔ عجب نہیں کہ تم ان روایات میں مختلف ہو جاؤ۔ پس اگر تم نے احتیاط نہ کی۔ اور تمہاری روایات اور بیانات میں اختلاف ہوا۔ تو بعد میں آنے والوں کے ہاں اختلاف زیادہ ہو جائے گا۔ لہذا بغیر پورے اطمینان کے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث روایت نہ کرنا۔ اور اگر تمہاری روایتوں میں کسی وقت اختلاف پیش آئے۔ تو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ یوں کہہ دینا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب موجود ہے۔ اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھو۔ اس روایت سے ظاہر ہے کہ صدیق اکبرؓ کا مقصود یہ ہے کہ احادیث کی روایت میں اطمینان اور احتیاط لازم ہے۔ روایت کا دروازہ بند کرنا مقصود نہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا۔ کہ جب صدیق اکبرؓ سے دادی کا پوتے کی میراث میں حصہ کے متعلق دریافت کیا گیا۔ اور اس کا حکم کتاب اللہ میں نہ پایا۔ تو کس طرح اس کے متعلق احادیث نبویہ کو دریافت کیا۔ اور جب ایک ثقہ اور معتبر

آدمی یعنی مغیرہؓ نے اس بارہ میں حدیثِ نبوی کی خبر دی۔ تو اس پر اکتفا نہ فرمایا۔ بلکہ بنظر احتیاط ایک دوسرے ثقہ اور معتبر یعنی محمد بن مسلم سے اس کی تصدیق اور توثیق طلب کی۔ اور یہ نہیں فرمایا کہ ہمیں اللہ کی کتاب کافی ہے۔ جیسا کہ خوارج کہتے ہیں"۔۔۔۔
(تذکرۃ الحفاظ ذہبی ص۳ جلد ۱)

برق صاحب نے تذکرہ الحفاظ کے اس صفحے سے حوالہ نقل کیا ہے۔ مگر مصنف تذکرہ کی اس حدیث پر جو رائے اس سلسلہ کی دوسری روایات کو ملانے سے درست اور صحیح ہے۔ اس پر مطلق توجہ نہیں دی۔ یہ تلبیس اور تحریف نہیں تو اور کیا ہے۔

امام نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں:۔

"قاضی عیاض فرماتے ہیں۔ کہ صحابہ اور تابعین میں کتابت علم کے بارے میں اختلاف تھا۔ بہت سے علم کی کتابت کو ناپسند کرتے تھے۔ مگر بعد میں تمام مسلمانوں کا کتابت کے جائز ہونے پر اجماع ہو گیا۔ اور وہ اختلاف ختم ہو گیا"

عہد نبوت ہی سے کچھ صحابہ حضورؐ کے ارشادات قلمبند کیا کرتے تھے۔ وصال کے بعد اس میں ترقی ہو گئی۔ لیکن اکثر صحابہ زبانی ہی روایت کرتے تھے۔ اور اگر کوئی شاگرد ان کی حدیثوں کو لکھنا چاہتا تو اسے منع کر دیتے۔ ابو نضرہ کہتے ہیں۔ کہ میں نے ابو سعید خدری سے عرض کیا کہ کیا جو حدیثیں ہم آپ سے سنتے ہیں۔ انہیں لکھ لیا کریں۔ انہوں نے فرمایا کہ ہم سے حضورؐ زبانی ارشاد فرماتے تھے۔ اور ہم اسے سن کر یاد کر لیتے۔ پس جس طرح ہم نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سن کر زبانی یاد رکھا ہے۔ تم بھی اس طرح یاد رکھو۔

ابو موسیٰ اشعریؓ نے ایک دن لوگوں کو اپنی روایت فرمودہ حدیثوں کو تحریر میں لاتے

دیکھ لیا - تو فرمایا - مجھ کو دکھلاؤ - کیا لکھا ہے - اور پانی منگا کر سب کو دھو ڈالا - اور یہ فرمایا کہ جس طرح ہم نے حضورؐ سے زبانی سن کر یاد کیا ہے - تم بھی اسی طرح سن کر یاد کرو - یہ عشقِ نبویؐ کی انتہا ہے - کہ جس طریق سے سُنا ہے - اسی طریق سے تم کو سنائیں گے - اور تم کو اسی طرح سننا اور یاد کرنا ہو گا -

حافظ عسقلانی شارح بخاری لکھتے ہیں :-

"صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کو حدیث کی کتابت پسند نہ تھی - ان کو یہ منظور تھا کہ جس طرح ہم نے حضورؐ سے علم بطور حفظ لیا ہے - اسی طرح لوگ ہم سے بطور حفظ لیں - لیکن جب ہمتیں قاصر ہو گئیں اور علم کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہوا - تو علماء نے علم حدیث کو مدون کیا - اور کثرت سے کتابیں لکھیں - جس کی وجہ سے خیر کثیر حاصل ہوئی - فللّٰہ الحمد و المنّتہ" (فتح الباری جلد اول ص ۱۸۵)

منکرین حدیث خلفائے راشدینؓ کی احتیاط کو امتناع بنا کر پیش کرتے ہیں — اور راویوں کے اس مزاج کو کہ ان میں سے بعض کتابت کو پسند نہیں کرتے تھے - سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے یوں پیش کرتے ہیں - کہ اس سے یہ تاثر پیدا کیا جا سکے کہ دورِ اول کے مسلمان حدیث کو پسند نہیں فرماتے تھے - منکرین کو یہ سوچنا چاہیے - کہ اگر صحابہ کے نزدیک حدیث حجت نہ ہوتی تو وہ اس کی روایت کو کیسے جائز قرار دے سکتے تھے - جس چیز کی کتابت ناجائز ہے - اس کی روایت بھی ناجائز ہونی چاہیے - ہماری دیانت داری سے یہ رائے ہے - کہ برق صاحب کو صحیح صورت حال کا علم ہے اور وہ جان بوجھ کر غلط بحث پہ اُتر آئے ہیں - وہ اس باب سے یہ حوالے حدیث کے غیر مقبول ہونے پہ دے رہے ہیں - جو باب کہ حدیث کو تحریر میں لانے

کے ثبوت کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اور جن روایات کو وہ اپنے مقصد کے لیے پیش کرتے ہیں۔ وہ کتابت کیے جانے پر دلالت کرتی ہیں۔

برق صاحب کی بھی اپنے پیر بھائیوں کی طرح یہ عادت پختہ ہو گئی ہے کہ وہ حوالہ نقل کرتے وقت تحریف سے کام لیتے ہیں۔ پھر اس کا ترجمہ کرتے وقت صحت کا خیال نہیں رکھتے۔ اور اس پر دعوے یہ ہے کہ ہم صرف قرآن کی مدد سے دین کی عمارت کو استوار کر لیں گے۔ ہمارا یہ دعوے ہے کہ ان کرم فرماؤں کے حوالے اصل سے ملانے پر ہمیشہ غلط، اور ان کا ترجمہ آیات و احادیث مستند تراجم اور قواعد کی رو سے عموماً غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتا ہے۔ ان کے فتنہ سے بچنے کا سب سے زیادہ آسان علاج یہی ہے کہ ان کے دعوے کے دلائل میں جو حوالے ہوں۔ انہیں اصل کتابوں سے ملا کر دیکھ لیا جائے۔ برق صاحب کی کتاب دو اسلام اس قسم کی تحریف اور بددیانتی کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہم بفضلِ خدا اس کی ایک ایک سطر کی تردید کر سکتے ہیں۔

علمائے اسلام نے جن احادیث کو موضوع ثابت کیا ہے۔ اور اس فن پر مستقل کتابیں لکھ کر سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ ثابت کر دیا ہے۔ برق صاحب اور ان کے یارانِ طریقت ان موضوع روایات کو جن کی خامیاں واضح ہیں۔ اس طرح پیش کرتے ہیں۔ کہ گویا وہ صحاح میں سے ہیں۔ اور یوں ان لوگوں کو جنہیں تحقیق کی فرصت نہیں ہے۔ غلط فہمی میں مبتلا کر کے صحیح حدیثوں کا مخالف کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ اور اس پر دعوے یہ ہے۔ کہ ہم قرآن کا صحیح مفہوم لوگوں کو بتا کر نظام ربوبیت کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ دیانت سے بے بہرہ ہوں۔ ان کی طرف سے جو نظام

راجح ہوگا وہ کس درجہ راہِ صواب پر ہوگا۔ اس کا اندازہ کرنا اہل بصیرت کے لیے مشکل نہیں ہے۔

منکرین حدیث کی طرف سے اسی بات پر بہت زور دیا جاتا ہے کہ قرآن مفصل اور واضح ہے۔ آسان اور ہر شخص کے لیے بلا کسی مدد کے قابل فہم ہے۔ لہٰذا کسی روایت، کسی حدیث اور کسی سابقہ کوشش سے مدد لینا چنداں سود مند نہیں ہے۔

یہ روش اس لیے نہیں ہے۔ کہ انہیں احادیث کے وضعی ہونے کا یقین ہے۔

اور قرآن پر ایمان کی پختگی سے بہرہ مند ہیں۔ بلکہ اس دعوے کے پس پردہ یہ خواہش کار فرما ہے۔ کہ امت کو روایات سے دور کر کے قرآن کو اپنی مرضی کے معانی پہنائے جائیں۔ اور یوں لغتِ عرب، محاورہ عرب، اسلوب زبان، اولین وحی کی ترجمانی۔ اور جملہ افہام و تفہیم سے کٹ کر اس وقت کے تقاضوں کی روشنی میں قرآنی آیات کا ایسا مفہوم تخلیق کیا جائے کہ قرآن ہوتے ہوئے بھی نہ ہونے کے برابر ہو جائے۔ اور ہم ماڈرن ازم کے علمبردار بن جائیں۔

اُن

صاحبوں نے جب کبھی

ایسی کوشش کی ہے

اس میں

انہیں فاش ناکامی ہوئی ہے

ہم اس کی

وضاحت کیلئے

چند مثالیں پیش کرتے ہیں!

احادیث سے بے نیاز ہو کر آیاتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنا

خواجہ عباد اللہ صاحب اختر ایک عرصے تک منکرین حدیث کے ہراول دستے کے ہم رکاب رہے ہیں۔ اور گذشتہ چند سالوں سے ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کو آپ کی رفاقت کا فخر حاصل ہے۔ آپ نے اس ادارہ کے لیے جو کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔ ان میں انکارِ حدیث نمایاں ہے۔ ادارہ ہذا سرکاری گرانٹ سے چلتا ہے۔ رفقاء کو بھاری رقوم معاوضہ میں ملتی ہیں۔

خواجہ صاحب کی کتاب "اصولِ فقہ اسلامی اور حدود اللہ و تعزیرات" سے چند جواہرات ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

• کتب سابقہ میں سے ایک کتاب بھی محفوظ نہیں۔ کتبِ سابقہ کی کیفیت اور حیثیت ہماری احادیث کی سی ہے۔ کہ بہت عرصہ بعد مدون ہوئیں" صفحہ ۹۔

آپ لاکھ دلائل دیجئے۔ تحریری ثبوت پیش کیجئے۔ کہ تدوینِ حدیث کا کام عہد رسالت میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ مگر یہ بزرگوار یہی رٹ لگائے جائیں گے۔ کہ ڈھائی سو سال بعد احادیث مدون ہوئی ہیں۔ لہذا غیر یقینی ہیں۔

• بعض روایات سے پایا جاتا ہے کہ یہ واقعہ افک خاص حضرت عائشہ صدیقہ ام المومنین کے متعلق ہے۔ ہم نے اس پر اپنی کتاب صدیق اکبر میں مفصل بحث کی ہے۔ اس مقام پر اتنا اشارہ کافی ہے کہ یہ واقعہ افک در اصل واقعات ہیں۔ اور ایک نہیں

محصنات کے متعلق منافقین نے افواہیں پھیلائیں - اور جھوٹی ثابت ہوئیں - واقعہ افک کو حضرت عائشہ سے منسوب کرنا بھی افک ہے - ...... جس واقعہ میں افسانوی پہلو پیدا ہو سکتا ہے - بیکار لوگ اس میں رنگ آمیزی کرتے ہی رہتے ہیں - تھوڑی سی بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں - آیات قرآن کا شان نزول ان ہی بیکاروں کی پرواز تخیل ہے - حالانکہ شان نزول خود آیات ہی بنا رہی ہیں - روایات یا حکایات کو دیکھو - تو ہر ایک آیات کے متعلق لکھا ہو گا - کہ فلاں شخص فلاں صحابی کے حق میں نازل ہوئی - نادان دوستوں نے قرآن حکیم کی عام ہدایات و احکام کا استقلال ہی باقی نہیں رہنے دیا" ص ۳۸

اختر صاحب نے بظاہر ام المومنین حضرت عائشہ کی ذاتِ گرامی کی عزت و حرمت کو اپنے پیشِ نظر رکھنے کا تاثر دیا ہے - لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ آیات کے شان نزول کی جملہ روایات کو تباہ کرنا چاہتے ہیں - تاکہ اس ذخیرہ علمی کے کالعدم ہو جانے کے بعد وہ اور ان کے رفقاء آیاتِ قرآنی کا جو مفہوم چاہیں - اس کی تخلیق کر سکیں - ہمیں اس امر کا اعتراف ہے - کہ ہر آیت کے شانِ نزول کو اتنی اہمیت نہیں دی جا سکتی کہ وہ آیت صرف اسی واقعہ سے متعلق ہو کر رہ جائے اور اس کا افادہ عام جاتا رہے - شاہ ولی اللہ صاحب نے الفوز الکبیر میں اس قسم مسئلہ سے متعلق جو گفتگو کی ہے - اس کے مطالعہ پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شانِ نزول کا جاننا نہایت ضروری ہے - اس کے بغیر قرآن کا اکثر حصّہ صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں جا سکتا - لیکن منکرین حدیث و روایات عہد نبوی صلعم کی تاریخ کو ضائع کرنے کے در پئے ہیں - اور اس مقصد کے لیے اس طرح کے مشورے دینا ان کا روزمرہ ہو گیا ہے -

حضور نے قرآن کے الفاظ کا جو مفہوم متعین فرمایا - اور محاورہ عرب کی رو سے

جو جائز اور درست تھا۔ اور اس مفہوم نے اصطلاح کی جو صورت اختیار کر لی۔ اسے بدلنے کی کوشش کرنا نہ علمی طریقہ تحقیق ہے نہ مذہبی دیانت داری ہی اس کی اجازت دیتی ہے۔ چور کی سزا ہاتھ کاٹنا قرآن کی نص سے ثابت ہے۔ اس نص کو تو بدلا نہیں جا سکتا۔ اگر اسے بدلا جائے تو قرآن سے انکار لازم آتا ہے۔ اب منکرین حدیث یہ روش اختیار کرتے ہیں۔ کہ لفظ ید کو ایسے معنی پہنائے جائے کہ اس نئے ملبوس میں اس کا حلیہ ہی بگڑ جائے اور یوں آیت کو لفظی طور پر بحال رکھتے ہوئے بھی کالعدم کے درجہ پر پہنچا دیا جائے۔

خواجہ عباد اللہ اختر کی اس مسئلہ پر جو تحقیق ہے۔ وہ ملاحظہ کیجئے۔ کتنی بے جا جسارت اور اسلام سے دشمنی ہے۔

"قطع ید کا مفہوم وہی کچھ ہے وہ جو منکل کا ہے۔ اور نکال دست درازی سے مجرم کے ہاتھ کو کوتاہ کرنا ہے۔ یا اس کے ہاتھ باندھ دینا۔ جو ہتھکڑی کرتی ہے۔ ...... محاورہ میں قطع ید کے معنی قوت منقطع کرنا، سلب کرنا ہے۔ امام راغب قطع کا مفہوم یہ واضح کرتے ہیں۔ کہ کسی مادی شئے کو کاٹنا جو بصر سے محسوس ہو۔ یا معقول اشیاء کو جدا کرنا جس کا ادراک بصیرت سے ہو .... اگر لفظ نکال اور قطع ید کے مفہوم کو جو ہم نے بحوالہ آیات واضح کیا ہے۔ ملحوظ رکھا جائے۔ تو مفہوم آیات زیر بحث کا یہ ہے کہ چور کے ہاتھ چوری سے روک دو۔ یا بند کر دو۔ اور ہاتھ کاٹنے سے یہ مدعا تو حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر اور ذرائع بھی ہیں۔ مثلاً۔ قید و بند اور قید خانہ میں ان کی اصلاح جو اصل غرض ہے۔" ص ۴۹۔۵۰

قید خانوں میں جو اصلاح ہوتی ہے۔ اس سے اب ساری دنیا واقف ہے۔ اختر صاحب نے زبان اور ادب کے تمام ضابطوں کو بالائے طاق رکھ کر لغت، کو محاورہ

اور محاورہ کو لغت کے مفہوم میں رکھنے کی جسارت کر کے قطع ید کو ہاتھ کاٹ دینے سے ہٹا کر ہتھکڑی کے حوالے کر دینے کا مفہوم عطا فرمایا ہے۔ اور اس امر کی جانب بالکل توجہ نہیں دی۔ کہ یہاں قطع کا لفظ کاٹنے کے سوا کسی اور معنی میں استعمال کیے جانے جانے کے لیے کوئی قرینہ نہیں رکھتا۔ اور ید کا لفظ قوت یا استعداد کے معنی میں مستعمل ہونے کے لیے مجاز کی کسی قسم کی رُو سے مجاز نہیں ہے۔ یہ بات تو بالکل ایسی ہی ہوئی کہ کوئی کہے۔ "یار میں تمہارے انتظار میں مر گیا مگر تم نہ آئے"۔ اور اسے یہ جواب دیا جائے۔ "غلط بکتے ہو مردہ بھی کبھی بولا کرتا ہے"۔ اور کوئی کہے کہ میں غم کھاتا ہوں۔ اور اسے کھانا نہ دیا جائے کہ یہ پہلے ہی سے سیر ہے۔

یہی صاحب شہادت کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرماتے وقت لکھتے ہیں:۔

"دو آدمی گواہ بھی مقرر لیا کرو۔ یا ایک مرد اور دو عورتیں۔ اس لیے کہ "ان تضل احدھما فتذکر احدھما الاخریٰ"۔ اگر ایک شخص بھول جائے تو دوسرے کی شہادت اس کی یاد تازہ کر دے"۔ صفحہ ۵۶۔

یہاں مراد یہ ہے کہ اگر ایک عورت بھول جائے تو دوسری عورت اسے یاد دلا دے۔ اگر اختر صاحب یوں ترجمہ فرماتے۔ تو انہیں عورت اور مرد کی صحیح اسلامی "مساوات" کا اظہار کرنا پڑتا۔ اور یہ یورپ کے خلاف بات ہوتی۔ جو انہیں منظور نہیں ہے۔ لہذا اس معنی سے اعراض کیا گیا ہے۔

"جب عزیز مصر کی زوجہ نے قمیص پیچھے سے پکڑی۔ جب کہ وہ بھاگ کر دروازہ کے قریب پہنچ گئے تھے۔ تو قمیص پیچھے سے پھٹ گئی۔ عین اس وقت عزیز مصر دروازہ پر نظر آیا۔ عورت نے واویلا شروع کر دیا۔ کہ یوسف اس کی عصمت دری کرنا چاہتا تھا۔

یوسف نے اپنی بریت میں واقعہ بیان کیا۔ عزیز مصر نے کہا کہ اگر یہ قمیص پیچھے سے پھٹی ہے۔ تو عورت جھوٹی ۔۔۔ اور اگر آگے سے پھٹی ہے۔ تو یوسف جھوٹا ۔ چنانچہ عورت جھوٹی ثابت ہوئی۔ ص۵۸

جس نے بریت کے لیے اس امر کے مشاہدہ کرنے کا قرآن میں مشورہ دیا ہے۔ وہ عزیز مصر نہیں ہے۔ بلکہ ملکۂ مصر کے اہل کا ایک شاہد ہے۔ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا، اگر عباداللہ صاحب دوسرے معترجین کی طرح صداقت کا اظہار کرتے۔ تو ان کی انتاج کیا ہوتی۔ ان بزرگوں کو لاکھ سمجھا یئے۔ کہ آیات کا مفہوم بیان کرتے وقت اہل عرب کے محاورے کا لحاظ رکھئے۔ مگر یہ نہیں مانیں گے۔ گواہ کو قاضی اور قاضی کو گواہ بنا دینے کی یہ نادر مثال کتنی مضحکہ خیز ہے۔ یہ سب قرآن کو اپنی مرضی سے معنی پہنانے کی بدولت ہے

۔ مصر اس وقت نو صوبوں میں منقسم تھا۔ جس کے حالات ڈاکٹر بردغش بے ارمنی نے اپنی تاریخ مصر میں جو کتبوں سے مرتب کی لکھے ہیں۔ انتہائی شمالی مشرقی صوبہ مجمع البحرین تھا۔ دریائے نیل اور البحر۔ بحیرہ روم کے اتصال سے شروع ہو کر بحر قلزم تک پھیلا ہوا تھا ۔ اس علاقہ کے گورنر کے پاس حضرت موسیٰ تربیت کے لیے آئے۔ گورنر نے دیکھا کہ نوجوان موسیٰ ہونہار ہے۔ مگر تعجیل پسند ہے۔ اس لیے اس کی اصلاح کی۔ منجملہ اور باتوں کے ایک لڑکے کو قتل کر دیا۔ اور بعد میں حضرت موسیٰ کی تسلی کر دی۔ کہ اس نے یہ کام خلاف قانون نہیں کیا۔ وَ اَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ــــ اس کے والدین تو ایماندار (امن پسند) ہیں۔ ہم اس بات سے ڈرے کہ یہ ان کو سرکشی اور کفر میں مبتلا کرے گا۔

پس ارادہ کیا ہم نے اس کا نعم البدل دان کو ان کا پروردگار پاکیزہ لڑکے دے۔
جو مہربانی میں اقرب ہو۔ صفحہ ۷۰۔

دعوائے اہل قرآن ہونے کا اور قرآن سے یہ بے اعتنائی اور حقائق سے یہ بیر۔ اور صداقت بیان سے یہ کد۔ عباد اللہ اختر صاحب کے لیے زیب نہیں دیتی۔ انہوں نے ڈاکٹر بروغش کی اسیرچ کو تو تسلیم کر لیا۔ جو خود قابل ہزار اعتراض ہے۔ مگر قران کے صریح اور واضح مطالب کو پس پشت ڈال دیا۔

قرآن میں ہے

موسٰی علیہ السلام نے اپنے دشمن قبیلے کے ایک فرد کو جب قتل کر دیا۔ تو وہ ایک فردِ مخلص کی اطلاع پا کر وہاں سے نکل گئے۔ فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝ پس وہ نکل گیا ڈرتا ہُوا راستہ دیکھتا ہُوا۔ موسٰی نے کہا۔ میرے رب! مجھے ظالموں کی قوم سے نجات دے۔ یہ خروج مجبوری کے باعث تھا۔ تربیت کے لئے گھر والوں نے نہیں بھیجا تھا۔

لیکن اختر صاحب فرماتے ہیں کہ موسٰی شاہی حکم سے تربیت کے لیے ایک گورنر کے پاس بھیجے گئے۔ اب وہ گورنر ایک بچے کو قتل کرتا ہے۔ اسے یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ جو ابھی نہایت کم سن ہے۔ اور اس سے اس کے آئندہ حالات کا کوئی اشارہ ظہور پذیر نہیں ہو رہا ہے۔ وہ آئندہ والدین کی گمراہی کا باعث ہوگا۔ نیز اسے یہ کیسے یقین تھا کہ اس کے قتل کے بعد اس کے والدین کو اس کا نعم البدل (ایک نہیں بلکہ زیادہ) ملے گا اور ضرور ملے گا۔ آخر قرآن کو براہ راست سمجھنے کے ایک دعویدار کو اس پر سوچنا چاہیئے تھا۔ مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ اگر اس "شخص" کو علم الدنی کا مالک مانا جاتا ہے۔ تو وہ اس وقت کا گورنر نہیں ہو سکتا۔ اور اگر جمہور مسلمانوں سے ہم نوا ہو کر اللہ کا خاص بندہ مانا جاتا۔ تو موسٰی علیہ السلام کا اس تک پہنچنا بادشاہ وقت (فرعون) کی مرضی سے ثابت کرنا نہایت دشوار ہو جاتا۔

اس ایک مثال ہی سے اہل دانش سمجھ سکتے ہیں کہ روایات کے منکر ہمیں کدھر لے جانا چاہتے ہیں۔ جو حکومت ان مہربانوں کو گرانٹ دیتی ہے۔ اسے سوچنا چاہیے کہ ایک عدالت آگے جا کر بھی لگنے والی ہے۔ وہاں اس الطاف بیجا کی یقیناً پرسش ہوگی۔ اور نوازش ہائے خسروانہ کا حساب دینا ہوگا۔

کوئی صاحب یہ کہنے کا مجاز نہیں ہے کہ عباد اللہ صاحب اختر منکرین حدیث کے "زمرہ عالیہ" سے خارج ہیں۔ اور آپ خواہ مخواہ انہیں اس جماعت میں شامل کر کے ادبی ناانصافی کر رہے ہیں۔ ہم صرف ایک حوالہ اس سوال کی تردید کے لیے پیش کرتے ہیں :۔

فرماتے ہیں ——— "لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتاب اصول تو قرآن ہی

ہے۔ باقی سب وقتی اجتہادات تھے۔ خواہ وہ آنحضرت یا خلفاء راشدین یا آئمہ دین سے منسوب[1] ہوں۔ اور قرآن کی طرح دائمی نہیں ہو سکتے۔ اور آنحضرت اور خلفاء اور آئمہ دین نے بھی یہی حقیقت بخوبی سمجھی ہوئی تھی۔ اس لیے آنحضرت نے تاکیداً فرما دیا تھا۔ کہ قرآن کے سواء اور میری کوئی بات مت لکھو۔ چنانچہ دو سو برس تک تو اسی ارشاد نبوی پر سختی سے عمل ہوتا رہا۔ اور اس عرصہ میں کوئی حدیث قلمبند نہ ہوئی۔" صفحہ ۸۱۔

ہم نے اس روایت کو صحیح صورت میں اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ اختر کا یہ دعوٰے کتنا جسارت آمیز ہے۔ کہ کوئی حدیث نہیں لکھی گئی۔ حالانکہ یہ روایت جس کتاب (مسلم) سے انہوں نے لی ہے۔ وہ خود حدیث کی کتاب ہے اور اس کے ساتھ اور روایات اس مطلب کی موجود ہیں کہ تحریر کا کام حضور کے عہد مبارک ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ بلکہ آپ نے خود بھی بعض احکام لکھوائے تھے۔ اس موضوع پر علمائے اسلام نے "تدوین حدیث" کے زیر عنوان کافی روشنی ڈالی ہے۔

ایک اور حوالہ ملاحظہ ہو:۔

وہ بات تو صرف اتنی ہے۔ کہ قرآن کے جامع و مانع اصول احکام ہمارے پاس موجود ہیں اور تفقہ کا حق ہر اہل الرائے کو حاصل ہے۔ اور تمام احکام شریعت جو تفقہ کے بعد وضع ہوں۔ شورٰی ہی میں ہوں گے۔ کسی واحد شخص کا تفقہ قابلِ عمل نہیں ہو سکتا۔ کہ آج ایک ملا کھڑا ہو[2] جائے۔ اور ایک رسالہ احکام شریعت کا تصنیف کر کے

---

[1] فی الحال آپ منسوب کو قبول کر لیں۔ آئندہ منسوب کو بھی منکرین حدیث خارج کر لیں گے۔ اور لکھا کریں گے "خواہ آنحضرت کے ہوں"۔ [2] یہ صاحب ملا کے کھڑے ہونے سے بہت ڈرتے ہیں۔

کہے۔ کہ اس پر عمل کرو۔ اور کہے کہ میں مجدد وقت ہوں۔ مجدد گو اصطلاحی نبی نہیں ہوتا۔ مگر ایک طرح کا نبی ہی ہوتا ہے۔ یا نبی کے اقرب ہے۔ یہ کھلی بغاوت انتظامیہ حکومت کے خلاف ہے۔ جو اپنے قوانین وضع اور نافذ کرتی ہے۔ اور یہ بزعم خود غلط ملا متوازی قوانین وضع اور نافذ کرنا چاہتا ہے۔۔۔۔" صفحہ ۹۹

"اگر کوئی ہم سے پوچھے تو وہ اور بھی مجتہد ہیں جن کا درجہ ان سب مجتہدین سے اعلےٰ وارفع ہے۔ وہ مجدد اور محدث ہے۔ یہ نبوت کے اقرب ہوتے ہیں۔ جب چالاک لوگوں نے دیکھا کہ ختم نبوت کا عقیدہ مسلمانوں کے ذہن میں ایسا پختہ ہو چکا ہے۔ کہ اب دعوائے نبوت کرنا بے فائدہ ہے۔ تو مجدد اور محدث کی اصطلاح اختراع کی عقل کے اندھے اور گانٹھ کے پورے دنیا میں بہت ہیں۔ ان کو بھی ایسے ہی لوگوں کی تلاش رہتی ہے۔ ان مجددوں اور محدثوں کا کام چل جاتا ہے۔" صفحہ ۱۰۲

یہ انداز بیان، ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ایک رفیق کا ہے ـــــ ملاحظہ کیجئے اور ادارہ کے حسن انتخاب کی داد دیجئے۔ کہ اس نے کیسے کیسے نادرہ روزگار اشخاص کو قبول فرمایا ہے۔ اگر خواجہ عباد اللہ صاحب نے ہماری کتاب "حیات مجدد" مطالعہ کی ہوتی تو اس جسارت اور اتہام سے باز رہتے۔ ہم انہیں مشورہ دیتے ہیں کہ اپنے ادارہ سے ملحقہ مجلس ترقی ادب کے دفتر سے حیات مجدد کا نسخہ لے کر ملاحظہ فرمائیں ہمیں امید ہے کہ وہ صرف ایک مجددؒ کے حالات، ان کا اعلائے کلمۃ الحق، ان کی فراست اور ان کی خدمتِ اسلام کا صحیح علم حاصل کریں گے تو وہ اپنی ان سطور پر شرم کے مارے۔۔۔۔۔ پانی پانی ہو جائیں گے۔ ایسے بزرگواروں کو چالاک کا خطاب دینا کورچشمی اور بدنصیبی ہے کہ رستاین کیلر کے پرداتوں اور نیٹو کے ہم شربوں کا اجتہاد

امت کے لیے کیسے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ امت تو ابو حنیفہ، محمد، مالک اور شافعی کی دلدادہ ہے۔ شمع رسالت کے پروانے، غلاظت و کثافت کے بھوکے بھنوروں کو کسی شمار قطار میں نہیں لاتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں شوریٰ کا بڑا احترام ہے۔ اور اس کے فیصلے جو قرآن اور سنت کے مطابق ہوں۔ قابل قبول اور حجت ہوتے ہیں۔ مگر جدید دور کی انجمنوں کی بنائی ہوئی شوریٰ۔ جس کے نمائندے تفقہ اور تقویٰ سے دور ہوں۔ جن میں سے اکثر کی راتیں شبینہ کلبوں میں کٹتی ہوں۔ یہ حق نہیں رکھتی۔ امتِ مسلمہ کا مزاج اس طرح تشکیل پذیر ہوا ہے۔ کہ دین کے معاملات و مسائل میں اجتہاد اگر ایک ادارہ یا گروہ، یا مجلس کرے گی تو اسے دل و جان سے کبھی قبولیت نہیں ملے گی۔ پیروی کرنے کے لیے ایک فرد کی پیروی جس اہتمام اور ذوق و شوق سے کی جاتی ہے۔ وہ ایک سے زیادہ افراد کی ہو نہیں سکتی اسی واسطے ہر شخص اپنے اپنے مسلک کا نام لیتے وقت اس مسلک کے قائد کا نام لیتا ہے۔ اور حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی کہلاتا ہے۔ ان بزرگواروں کا کیریکٹر ایسا عمدہ تھا کہ عوام اس پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ ان کا اجتہاد ان کے لیے حجت اور دلیل شرعی ہے۔

یہ مثالیں صرف ایک اہل قرآن کے ہاں ملتی ہیں۔ ان کی بساط پر اور کھوٹے سکے بھی ہیں۔ (جن سے ہم نے تعرض نہیں کیا) اگرچہ ان پر سرکاری مہر لگا دی گئی ہے۔ مگر ان کا تاؤ بھاؤ جعل سازی کا مرقع ہونے کا نقیب ہے۔ ان کے دوسرے ہم کار جعلی سکوں کے انبار لیے گلی کوچوں میں نعرہ زن ہیں۔ کہ پرانے سکے دے دو۔ نئے سکے لے لو۔ ان کا نعرہ چند کوچوں میں تو مقبول ہو رہا ہے۔ مگر جہاں روشنی ہے وہاں

ان کی دال نہیں گلتی۔

مولانا رومیؒ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

قلب پہلو مے زند بالزر بشب

انتظار روز مے دار ذہب

سادہ لوح علماء کا مشورہ

منکرین حدیث کے زمرہ میں بعض بزرگوار نادانستہ طور پر شامل ہیں۔ جہاں ایک طرف ان بزرگواروں کے قلم سے اسلامی افکار کی خدمت ہوتی ہے۔ وہاں دوسری طرف ان کا قلم روایت پسندی کو ضعف پہنچانے کا کام دیتا ہے۔ مولانا محمد حنیف صاحب ندوی کو ہم منکرین حدیث کا ہم نوا قرار دینے کی جرأت تو نہیں کر سکتے۔ لیکن ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور میں خواجہ عباداللہ اختر ایسے ادیبوں کی شمولیت اور ان کے گروہ سے مولانا موصوف کا اشتراک عمل اسلام کے لیے مفید نہیں ہے۔

مولانا محمد حنیف صاحب "مقام سنت" میں ۹۳ صفحہ پر انکار حدیث کے علم بردار اور روایت پرستوں کا محاکمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف قرآن کے سوا ہر چیز کو غیر وحی ہونے کی وجہ سے ظن محض اس لیے ساقط الاعتبار قرار دیا جا رہا ہے۔ اور دوسری جانب ہر دینی علم و فن کو عین وحی بنایا جا رہا ہے۔ صاف الفاظ میں ممکن ہے۔ اس کا اظہار نہ ہوتا ہو۔ لیکن عمل کی دنیا میں یہی کچھ نظر آ رہا ہے۔ کچھ لوگ ایسے دیکھنے میں آئے ہیں۔ کہ ان کے سامنے اقبال کا شعر پڑھیئے تو جھوم جائیں گے۔ مثنوی رومی کا شعر گنگنایئے تو سر دھننے لگیں گے برکلے، نٹشے، آئن سٹائن اور برگساں کے فلسفے بیان کیجئے یہ ہمہ تن گوش بن جائیں گے۔ یہ سب کچھ ہو گا۔ لیکن اگر حدیث رسول کہہ کر کچھ سنایئے تو نگاہوں میں غضب، دماغ میں جذبۂ تردید اور دل میں اعراض و بے رخی کے انداز پیدا ہو جائیں گے۔ اور

دوسری طرف کچھ احباب ایسے بھی دکھائی دیں گے۔ کہ ان کے سامنے کتنی ہی واضح الدلالۃ آیت پڑھیئے۔ وہ اس پر غور کرنے کی بجائے پہلے یہ غور فرمائیں گے کہ اس کے خلاف کوئی روایت تو موجود نہیں؟ یعنی اگر ہو تو آیت قرآنی کی تاویل کر دی جائے ورنہ روایت کی پشت پناہی کی وجہ سے مضمون آیت کو بھی مان لیا جائے"۔ ؎۱

جو لوگ حدیث پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ وہ (مولانا کو معلوم ہے) مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا شکار ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ احادیث کوئی مستند سرمایہ علمی نہیں ہے۔ مصر کا ایک مشہور عالم ڈاکٹر شیخ مصطفیٰ لکھتا ہے۔

"دور جدید میں بعض مستشرقین اور استعمار و استبداد کی راہ ہموار کرنے والے عیسائی مبلغین نے حدیث کو اعتراضات کا ہدف بنا کر مسلمانوں کے دلوں میں شکوک ڈالنے کی کوشش شروع کی۔ اور اس فتنہ پردازی سے ان کا مقصد یہ تھا کہ شریعت اسلامی کے اس مضبوط اور مستحکم ستون کو گرا کر وحدت اسلامیہ کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ ان کا یہ جادو کام کر گیا۔ اور خود مسلمانوں میں ایسے لوگ (جدید منکرین حدیث) پیدا ہو گئے۔ جو یا تو مستشرقین کی ایسی نمائشی اور سطحی معلومات کے فریب میں آ گئے جو کسی سنجیدہ علمی تنقید کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی یا پھر انہوں نے اس موضوع کو اپنے ذہنی شبہات اور نفسانی جذبات کی تسکین کے لیے آڑ بنایا۔ اور کبھی یہ کوشش ہی نہیں کی۔ کہ اپنے مخصوص انفرادی نظریات کو اس کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیں ——— جو راسخ العلم اسلاف سے ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ چنانچہ ان فریب خوردہ اور کج فہم شاگردوں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر وہی راگ الاپنا شروع کر دیا۔ جو ان کے فرنگی استاد الاپ

؎۱ مقام سنت ص۳۹

رہے تھے۔"[1]

جو لوگ آیت قرآنی سن کر کسی روایت کی تلاش کرتے ہیں۔ ان کا مسلک مغرب نواز ناقدین کے مقابلہ میں حسن اور صائب ہے۔ مولانا موصوف نے روایت پرستوں کے مزاج کو واضح کرنے کے لیے ایک مثال دی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"ہم یہ گفتگو محض برائے وزن بیت نہیں کہہ رہے۔ یہ نہ سمجھئے کہ چونکہ ہم نے منکرین روایات پر طنز کی ہے۔۔۔ اس لیے ہم نے توازن قائم رکھنے کے لیے روایت پرستوں پر بھی ایک الزام گھڑ کر لگا دیا ہے۔ ایسا نہیں۔ ایک مثال سے ہماری گفتگو کی کسی قدر تصدیق ہو جائے گی۔ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اپنی مشہور عالم کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں یوں فرماتے ہیں:۔

"دوسری مثال حضرت عمرؓ کا یہ مسلک ہے "جو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے" کہ جنبی اگر پانی نہ پائے۔ تو اس کے لیے تیمم کافی نہیں۔ حضرت عمار بن یاسر نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے ایک سفر کا حال بیان کیا۔ کہ میں جنبی ہو گیا۔ اور پانی نہ ملا تو میں مٹی میں لوٹ گیا۔ اور میں نے رسول اللہ صلعم سے اپنا یہ طریقہ تیمم بیان کیا۔ حضور نے فرمایا کہ اس کی کیا ضرورت تھی۔ پھر حضور نے اپنے ہاتھوں کو زمین پر مار کر اپنے ہاتھوں اور چہرے پر پھیرتے ہوئے فرمایا۔ کہ یوں کر لینا کافی تھا۔ لیکن حضرت عمر نے کسی پوشیدہ علت کی وجہ سے اسے قبول نہ کیا۔ لیکن بعد میں یہ حدیث اس قدر مستفیض ہوئی۔ کہ اس کی عدم صحت کا وہم جاتا رہا۔ اور بالاتفاق یہ لائق عمل ہو گئی۔۔۔۔۔۔"

---

[1] سنت رسول۔ صفحہ ۱۷-۱۸۔ مترجم ملک غلام علی صاحب

آپ نے ملاحظہ فرمایا ہم جیسے کم علموں کو جنہیں سال میں ایک ختم قرآن کی نوبت بھی بمشکل آتی ہے۔ ایک جگہ نہیں دو دو جگہ (سورۃ نساء ع ۷ اور سورۃ مائدہ ع ۱) قرآن کے یہ الفاظ دکھائی دیتے ہیں۔ کہ .... اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا ...... یعنی اگر عورتوں کو چھو لو (صحبت کرلو) اور پانی نہ ملے۔ تو تیمم کر لو .... لیکن اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت عمر کو آخر عمر تک یہ آیات نظر نہ آئیں۔ یا اگر دیکھی ہوں گی تو سمجھ نہ سکے۔ اور اسی مسلک پر آخر دم تک قائم رہے۔ کہ جنبی کے لیے (اگر وہ پانی نہ پائے) تیمم کافی نہیں۔ کاش راوی یہ بھی بتا دیتا کہ پھر کیا چیز کافی ہے۔ روایت گھڑنے والے کو یہ بھی خیال نہ آیا۔ کہ وہ کس شخصیت کے بارے میں، اور کیا کہہ رہا ہے۔ زیادہ پر لطف بات یہ ہے۔ کہ عمار یاسر نے بھی حضرت عمر کے سامنے آیت تیمم نہیں پڑھی۔ شائد ان کی نظروں سے بھی آیت نہ گزری ہو گی۔ بہر حال آیت یاد ہو یا نہ ہو مگر انہیں حدیث یاد تھی۔ اور وہی حضرت عمر کے سامنے پیش بھی کی۔ پھر ایک اور تماشہ دیکھئے۔ عمار یاسر جیسے صادق القول اور زبان رسالت سے براہ راست سننے والے راوی کی بیان کردہ حدیث کو بھی حضرت عمر تسلیم نہیں کرتے۔ اور مزید برآں اسے تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں بتاتے۔ اور کیوں بتاتے جب کہ وہ ایک پوشیدہ علت تھی۔ اور سب سے تعجب کی بات یہ ہے۔ کہ حضرت عمر کو نہ تو حضرت عمار منکر حدیث کہتے ہیں۔ نہ دیگر صحابہ۔ اور ان سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک حدیث جو دور فاروقی میں غیر صحیح اور ناقابل عمل تھی۔ وہی بعد میں اس قدر مستفیض ہوئی کہ عدم صحت کا وہم جاتا رہا۔ اور بالاتفاق لائق عمل ہو گئی۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ تا؟ جنبی اگر پانی

نہ پائے تو اس کے لیے تیمم بعد کے دور میں جائز اور لائق عمل ہو گیا۔ مگر کس دلیل سے اور کیوں؟ قرآن سے اب بھی اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مسئلہ حدیث شریف ہی سے لیا گیا ہے۔ اور حدیث بھی وہ جو پہلے غلط اور نا قابل عمل تھی۔ اور بعد میں مستفیض ہو کر صحیح اور قابل عمل ہو گئی۔ اگر یہ حدیث نہ ہوتی۔ تو فتیمموا صعیداً طیباً ـــ والی دونوں آیتوں کو کہاں سے سہارا ملتا! یہی تو وجہ ہے کہ حضرت عمر آخری دم تک اپنے مسلک پہ قائم رہے! قرآن میں اگر کوئی آیت تھی۔ تو ہوا کرے، جب تک کسی روایت کی پشت پناہی نہ ہو بے چاری آیت تنہا کیا کر سکتی ہے۔ حضرت عمر کو چونکہ کوئی روایت نہ ملی۔ اور جو ملی بھی تو اس میں کوئی پوشیدہ علت تھی۔ اس لیے ان آیات تیمم کو آپ نے چنداں لائق اعتناء تصور فرمایا العیاذ باللہ

ایک اور نکتہ بھی قابل غور ہے۔ آیات تیمم میں دونوں جگہ طریقہ تیمم بھی بتا دیا گیا ہے۔ فامسحوا بوجوھکم وایدیکم اور فامسحوا بوجوھکم وایدیکم منہ یعنی اس پاک مٹی سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کو مسح کرو۔ مگر روایت میں ہے۔ کہ حضرت عمار مٹی میں لتھڑ گئے (لفظ کہیں تمعک ہے اور کہیں تمرغ) اور کیوں نہ لتھڑتے۔ ان کی نظر آیات قرآنی پر ہوتی جب تو انہیں طریقہ تیمم معلوم ہوتا! معلوم نہیں یہ روایت بیان کرنے سے راوی کا کیا مقصد تھا۔ جو اس نے ایک سرے سے سارے صحابہ کو قرآن سے بے خبر ثابت کر دیا۔

ذرا یہ بھی ذہن میں رکھئے گا۔ کہ یہ واقعہ نزول تیمم کے بعد کا ہے۔ اگر پہلے کا ہوتا تو تیمم کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ عمار حضور سے پہلے دریافت کرتے کہ اس حالت میں میں کیا کروں۔ اپنی طرف سے عمار کوئی اقدام نہ کرتے۔ نیز اگر نزول تیمم

کے بعد کا یہ واقعہ ہوتا تو عمار اتنے بے خبر نہ تھے - جو - فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِنْهُ - کا مطلب مٹی میں لوٹ جانا سمجھتے - اور اس پر عمل کرتے - حضرت عمار اپنا یہ واقعہ حضور کے بہت بعد بیان فرماتے ہیں - اگر حضور کی زندگی میں بیان کرتے - تو اس کا سیدھا فیصلہ یہ ہوتا کہ حضور سے جا کر دونوں دریافت یا تصدیق فرما لیتے - لیکن راوی تو یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ دورِ فاروقی تک صحابہ میں کسی کی نظر قرآن تک نہ گئی - ہر شخص کی نظر احادیث پر لگی رہتی تھی - مگر افسوس کہ قرآنی حکم تو یوں گیا کہ اس پر حضرت عمر کی نظر نہ پڑی - اور عمل بالحدیث یوں گیا کہ جو روایت ملی بھی اس میں کوئی رازدارانہ پوشیدہ نقص تھا - اور یہ گتھی آخر عمر تک حضرت عمر سے نہ کھل سکی - کھلی تو بعد والے لوگوں پر "طبقہ ثانیہ" میں -

اس روایت سے ایک معمولی سمجھ کا انسان بھی اس نتیجے پر پہنچے گا کہ ایک صاف و صریح قرآنی مسئلہ بھی حضرت عمر کے پیشِ نظر نہ رہتا تھا - جو قرآن سے استدلال و استشہاد کر کے اصل مسئلہ بتاتا - سب کی نظریں قرآن سے ہٹ کر صرف احادیث پر لگی رہتی تھیں - یعنی اگر کوئی روایت مل گئی تو فبہا - ورنہ قرآن کے صاف و صریح مسئلے کو بھی وہ اپنے لیے کافی نہ سمجھتے تھے - اور ساری عمر ادھر ان کی توجہ نہ جاتی تھی -

بہرکیف راوی ایک لحاظ سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا - اور آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو قرآن سے پہلے کسی روایت کو تلاش کرتے ہیں - اگر روایت کا سہارا مل گیا تو مجبوراً قرآنی حکم کو بھی تسلیم کر لیں گے - ورنہ روایت اگر اس کے خلاف ملی تو آیت ہی کی تاویل فرما دیں گے - یہ اثر اس قسم کی روایات کا ہے - جن کا ایک

نمونہ آپ نے ملاحظہ فرما لیا۔ لیکن کیا اس کے لیے بھی آپ کسی کو تیار پائیں گے کہ ایسی مشتبہ روایات کو صحاح و سنن سے خارج کر کے صرف صحیح روایات کو باقی رہنے دیا جائے! آپ قرآنِ کریم میں منسوخ الحکم اور منسوخ التلاوۃ اور منسوخہما کا اعتراف تو کر سکتے ہیں۔ مگر روایات کی کتابوں میں تو اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ..... بعد میں سب کی سب اس قدر مستفیض ہو گئیں کہ عدم صحت کا وہم جاتا رہا۔ اور بالاتفاق سب کی سب لائقِ عمل ہو گئیں......" [۱]

ہم نے یہ اقتباس بلا کم و کاست درج کیا ہے۔ مولانا نے جس وقت اپنے حلقہ احباب میں یہ عبارت پڑھی ہو گی تو ان کے رفقاء نے اس پر مسرت کا اظہار کیا ہو گا۔ ادارہ کا پیر طریقت مسکرایا ہو گا۔ کہ مولانا نے حق خدمت ادا کر دیا۔ اور روایت پرستوں کی قلعی کھول دی۔ اور صحاح میں سے غلط مواد کو باہر نکال پھینکنے کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔ لیکن ہمیں یہ سطور پڑھ کر بے ساختہ ہنسی آئی ہے۔ اور ان ثقافت پرستوں کے مزاج پر ہم دل ہی دل میں کڑھے ہیں۔ بات نہایت مختصر اور قابلِ فہم تھی۔ مولانا نے خواہ مخواہ اس پر حاشیہ چڑھایا ہے۔

شاہ ولی اللہ کی کتاب ازالۃ الخفاء کے ایک حصّہ کا ترجمہ اسی ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے ایک دوسرے رکن مولانا ابو یحیٰی امام خاں نوشہروی نے کیا ہے۔ جسے فقہ عمر کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:۔

مسائل تیمم:۔ جنبی کے لیے تیمم روا نہیں۔ ابو بکر.... حضرت عمر

---

[۱] مقام سنت ص ۹۳ - ۹۸

نے فرمایا۔ جنبی کو اگر ایک ماہ تک پانی نہ ملے۔ تب بھی اس کے لیے تیمم روا نہیں۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر کے اس اجتہاد پر مندرجہ ذیل وجوہ سے کلام ہے۔ جیسا کہ سابق میں آپ سے بیان کیا گیا ہے۔ اور خود صاحب واقعہ حضرت عمار یاسر ہی نے آپ سے کہا کہ اے امیر المومنین! فلاں موقع پر میں اور آپ دونوں اسی مصیبت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ اور پانی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے تو ایک طرف تنہائی میں اپنے پورے بدن کا اس طرح تیمم کر لیا۔ جس سے جسم کے روئیں روئیں میں مٹی نے مس کیا۔ لیکن آپ نے تیمم کی کوئی صورت گوارا نہ فرمائی۔ پھر جب میں اور آپ دونوں جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں باریاب ہوئے تو میں نے اپنا واقعہ اور آپ نے اپنا ترک تیمم عرض کیا۔ اور دونوں کی گفتگو سن کر رسول اللہ نے فرمایا۔ اے عمار تمہارے لیے تو وہی کافی تھا۔ جو نماز میں کیا جاتا ہے۔ اور رسول اللہ نے اسے فعلاً بھی کر کے دکھایا۔ مگر امیر المومنین نے حضرت عمار یاسر کی اس روایت پر بھی التفات نہ فرمایا۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:۔

"لیکن حضرت عمر کے اس اجتہاد پر فقہائے اربعہ میں سے کسی نے عمل نہیں کیا۔ کیونکہ ان کے سامنے حضرت عمر بن حصین اور حضرت ابوذر اور حضرت عمرو بن عاص کی وہ مرفوع حدیث تھی جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے جنبی کو تیمم کا حکم دیا ہے۔ جس صورت میں کہ اسے پانی میسر نہ ہو۔

شاہ ولی اللہ یہ بھی فرماتے کہ جہاں تک میں نے غور کیا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خیال تھا کہ حضرت عمر اور عمار یاسر کے سامنے سورہ مائدہ اور نساء کی یہ دو آئتیں تھیں۔ جن سے دونوں نے اپنے اپنے فہم کے مطابق

قیاس کیا۔ اس لیے آنحضرت صلعم نے دونوں حضرات میں سے کسی کی تاویل کو رد نہیں فرمایا۔ بلکہ ہر ایک کو اس کی تاویل پر چھوڑ دیا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں ــــ اور حضرت عمر کا مرتبہ اس سے بہت بلند ہے کہ آپ کو بوقتِ اجتہاد اس حدیث (عمار یاسر) کا علم نہ ہو آپ اس معاملہ میں اللہ تعالےٰ سے بہت ڈرنے والے ہیں کہ آپ کو کسی حدیث کا علم ہو۔ اور آپ اس کی تاویل رسول اللہ صلے اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے منشاء کے خلاف کریں۔

ایک صاحب نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ میں جنبی ہو گیا تھا۔ پانی نہیں ملا اور میں نماز بھی نہیں پڑھ سکا۔ آنحضرت نے فرمایا تم نے درست کیا۔ ایک اور صاحب نے عرض کیا۔ میں جنبی ہو گیا۔ پانی نہیں ملا۔ تیمم سے نماز پڑھ لی اس سے بھی فرمایا۔ کہ تم نے درست کیا (بروایت سنن نسائی)"۔

عمار یاسر کی روایت کا ایک ٹکڑا اور ہے دو اقتباسات ہیں درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ (عمار کا یہ بیان سن کر) حضرت عمر نے فرمایا۔ اللہ سے ڈر۔ جواب دیا۔ یہ حدیث کسی کو نہ سناؤں۔ فرمایا۔ یہ آپ کی مرضی ہے۔ اصل الفاظ یوں ہیں:۔

فقال عمر اتق اللہ یا عمار فقال ان شئت لم احدث به فقال عمر نولیک ما تولیت (بخاری و مسلم)

یہ الفاظ ہمارے بہت کام کے ہیں۔ جب انہیں سنن نسائی کی روایت

لہ فقہ عمر۔ صـ ۳۸ - ۳۹

ملا کر دیکھا جاتا ہے۔ تو اس عدم اتفاق (مابین عمرؓ و یاسرؓ) کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضورؐ نے دونوں کی تاویل کو ناپسند نہیں فرمایا۔ یاسرؓ کے طریقہ تیمم میں نقص تھا۔ اسے دور کر دیا۔ اور آیاتِ قرآنی سے جو نتیجہ حضرت عمرؓ نے نکالا تھا اس پر سکوت فرمایا گیا۔ مولانا محمد حنیف صاحب ندوی نے ان آیات کا ذکر ایسے رنگ میں کیا ہے کہ بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کا مفہوم نہایت واضح اور بدیہی ہو گا۔ مگر صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ قرآن کی یہ دو آیات حضرت عمرؓ کے پیش نظر بھی تھیں۔ اور عمار یاسرؓ بھی ان سے واقف تھے۔ اور یہ واقعہ ان آیات تیمم کے بعد کا ہی ہے۔ راوی بھی ان آیات کے وجود سے واقف ہے۔ اور جو طریقہ استہزا تنقید کرتے وقت مولانا موصوف نے اختیار کیا ہے۔ وہ علمی روش سے بہت دور اور قابلِ افسوس ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ حضرت عمرؓ ان دونوں آیات میں مسِ نساء سے مباشرت مراد لیتے ہیں۔ مجامعت مراد نہیں لیتے۔ لہٰذا ان کے نزدیک مباشرت کے بعد تو تیمم روا ہے۔ مگر مجامعت کے بعد نہیں۔ .... آیئے ہم اس دعوے کے ثبوت کے لیے قرآن کی آیات پر تدبر کرتے ہیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكَارٰى
حَتّٰى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي
سَبِيلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوا ط وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضٰى أَوْ عَلٰى
سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لٰمَسْتُمُ
النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا

فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا o

۲ - وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ط وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ط -

ان دونوں آیات میں حالت جنب کے بعد تَغْتَسِلُوْا (غسل کر کے طاہر ہو جاؤ) اور فَاطَّهَّرُوْا (طہارت غسل کرلو) آیا ہے - اور لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ کے بعد پانی نہ ملنے کی صورت میں فَتَيَمَّمُوْا ہے - اگر لٰمَسْ کے معنی واضح اور متعین ہو جائیں تو آیات کا صحیح مفہوم متعین ہوتا ہے - اس تعین معنی کے لیے وحی کے مخاطب اول کا فیصلہ صائب اور حرف آخر ہے - اور اسی تعین کے لیے روایات کی طلب کی جاتی ہے - کیونکہ اس کے بغیر ہر کسی کو اپنی مرضی کے معنی پیدا کر لینے کی گنجائش میسر ہو سکتی ہے -

حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں :-

" امام شافعی کا یہ ارشاد ہے - کہ حضرت عمرؓ اور ابن مسعودؓ دونوں کا اجتہاد آیۂ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ سے مجامعت نہیں بلکہ محض مباشرت (بغیر مجامعت) ہے - اس لیے یہ دونوں حضرات اس پر

غسل کے قائل نہیں۔" [1]

یعنی تشنگی کی صورت میں پانی نہ ملنے پر تیمم حضرت عمرؓ کے نزدیک درست ہے۔ اور جنبی کے لیے روا نہیں۔ لیکن حضورؐ نے اس لفظ کا جو مفہوم دوسرے صحابہ کے سامنے بیان فرمایا تھا جو اس کا علم یقینی طور پر اہل علم کو ہو گیا تو عمار یاسر کی یہ روایت بھی زیادہ نفع بخش اور لائق عمل ہو گئی۔ اسی کو شاہ ولی اللہ صاحب نے مستفیض فرمایا ہے۔ یہ دورِ فاروقی میں غیر صحیح نہیں تھی۔ نہ ہی ناقابلِ عمل تھی۔ جیسا کہ مولانا موصوف نے صفحہ ۹۶ پر استدلال کیا ہے — ان کا یہ ارشاد اب ملاحظہ کیجئے۔

• قرآن میں اگر کوئی آیت تھی تو ہوا کرے۔ جب تک کسی روایت کی پشت پناہی نہ ہو۔ بے چاری آیت تنہا کیا کر سکتی ہے۔" صفحہ ۹۶

بندہ پرور! قرآن کی دونوں آیات میں زیر بحث لفظ کا مفہوم زبانِ رسالت کا محتاج ہے۔ جب آپؐ کا بتایا ہوا مفہوم معلوم ہو گیا۔ تو آیت اس وقت واضح ہوئی۔ اسی تعیین مفہوم کے لیے تو احادیث کا ذخیرہ قیمتی اور ضروری ہے۔ اس سرمایہ سے قطع نظر کر کے سب سے پہلا نقصان جو اسلامی تعلیمات کو پہنچتا ہے وہ یہی ہے کہ قرآن کا وہ مفہوم متعین نہیں ہو سکتا جو قرآن والے نے سمجھا تھا۔

اب رہی پوشیدہ علت والی بات۔ سو وہ یہی ہے کہ ان کے نزدیک لمس سے مراد مباشرت تھی۔ مجامعت نہیں تھی۔ نیز جب مولانا موصوف اس روایت کو گھڑا ہوا بتا رہے ہیں۔ تو ان کا یہ نتیجہ نکالنا کیسے درست ہے کہ وہ سب سے

---

[1] فقہ عمر صہ ۱۸ ملاحظہ ہو۔

زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ حضرت عمر کو نہ تو حضرت عمار منکر حدیث کہتے ہیں۔ نہ دیگر صحابہ" ص ۹۵۔

یہ نتیجہ تو تب درست تھا۔ جب مولانا اس روایت کو صحیح تسلیم کرتے اور یہ بتاتے کہ حضرت عمر نے حدیث کو قابل توجہ نہیں سمجھا اور پھر بھی انہیں کسی نے منکر حدیث نہیں کہا لہذا اے پاکستان کے علماء تم بھی جدید منکرین کو منکرین حدیث نہ کہو۔ جب آپ روایت ہی کو غلط قرار دے رہے ہیں تو اس سے وہ نتیجہ نکالنے کے کیسے مجاز ہیں جو اس کی صحت کی رو سے نکال سکتے تھے۔ رہا یہ سوال کہ وہ کیا اس کے لیے بھی کسی کو تیار پائیں گے کہ ایسی مشتبہ روایات کو صحاح و سنن سے خارج کر کے صرف صحیح روایات کو باقی رہنے دیا جائے" ص ۹۸

صرف مولانا موصوف ہی نے یہ مشورہ نہیں دیا۔ بلکہ دوسرے چند کرم فرما بھی ان کے اس ارادہ میں شرکت سے سرفراز ہیں۔ ان میں سے ایک کرم فرما سے متعلق ذیل کی سطور ملاحظہ ہوں۔

مدیر طلوع اسلام فرماتے ہیں :۔

"شروع دسمبر میں لاہور میں انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ ہوا جس میں ایک نشست حضور رسالت مآب کی سیرت طیبہ کے تذکار جلیلہ کے لیے مخصوص تھی۔ اس نشست کی صدارت سپریم کورٹ کے (سابق) جج، جسٹس محمد شریف صاحب (چیرمین سابق اسلامک لاء کمیشن، و رکن پاکستان آئین کمیشن) نے فرمائی، اس سلسلہ میں جو روئیداد اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا متعلقہ حصہ حسب ذیل ہے :۔

مولانا غلام مرشد نے علمائے اسلام کی اس فرو گذاشت پر کڑی نکتہ چینی کی کہ بعض

ایسی ضعیف روایات ہمارے اسلامی لٹریچر میں اب بھی موجود ہیں، جن سے نبی اکرمؐ کی بے ادبی کا پہلو نکلتا ہے۔ حتیٰ کہ حضور پاکؐ کی ازواجِ مطہراتؓ پر نمایاں حملوں کا مواد ہماری کتابوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس بے ادبی کا باعث اور بد طینت نقادوں کے مواخذ کو حذف کرنا حضورِ نبی کریمؐ سے محبت کا تقاضا اور ان کی غلامی کا اوّلین مطالبہ ہے۔ آپ نے مزید کہا رسول پاکؐ کی تکریم کے لیے ان روایات کو مسترد کر دینا چاہیے جو کسی بھی طرح حضور کی سیرتِ طیبہ کو مسخ صورت میں پیش کرتی ہیں۔

انجمن کے صدر مولانا غلام محی الدین قصوری نے پیش کش کی کہ وہ علمائے پاکستان کو اس مقصد کے لیے کام کرنے کی دعوت دیں گے۔ اور پاکستان سے باہر بھی لائبریریوں میں محفوظ اسلامی لٹریچر میں سے ان روایات کی نشاندہی کی جائے گی۔ جو اسلام کے بدخواہ بہتان لگانے کی غرض سے بالعموم استعمال کرتے ہیں۔ اندرونِ ملک ایک تحریک پیدا کر کے اپنے علمی ذخیرہ کو توہین آمیز مواد سے پاک کیا جائے گا۔ انجمن حمایت اسلام اس مقصد کے لیے روپیہ صرف کرے گی کہ سیرت حضورِ اکرمؐ پر مستند لٹریچر شائع کیا جائے۔

" اس مبارک و مسعود تحریک کا ہر اس گوشے میں بدل استقبال ہوا جو حضورِ رسالت مآبؐ کی عظمت و توقیر کو باعثِ تقویت ایمان اور وجۂ سعادتِ دارین سمجھتا ہے۔ لیکن آپ یہ معلوم کر کے متعجب اور متاسف ہوں گے کہ ہماری بدنصیب قوم میں ایسے عناصر بھی موجود ہیں جنہیں یہ تحریک بھی بے حد ناگوار گزری ہے اور وہ اس کی مخالفت کے لیے میدان میں اتر آئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی حالت یہ ہے کہ یحسبون کل صیحۃ علیھم (۶۳/۵) کہیں پتہ بھی کھڑکے تو ان کا دل دھڑکنے لگ جاتا ہے۔

کہ کوئی اور آفت ہم پر آئی۔ چنانچہ (سابق) جماعت اسلامی کے نقیب، ہفتہ وار ایشیا جس کے مدیر نصر اللہ خاں صاحب عزیز ہیں (کی ۲۰ر دسمبر کی اشاعت میں "مرضِ تشکیک کے بیماروں سے" کے عنوان سے ایک مقالہ افتتاحیہ شائع ہوا ہے۔ ہم اس مقالہ کو (اس کی طوالت کے باوجود) بہ تمام و کمال درج ذیل کرتے ہیں۔ تاکہ اس نازک ترین مسئلہ سے متعلق، اس گروہ کی پوری بات قارئین کے سامنے آجائے۔ ملاحظہ فرمائیے :-

بیان کیا گیا ہے کہ عالمگیری مسجد (لاہور) کے خطیب مولانا غلام مرشد نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے علمائے اسلام کو توجہ دلائی کہ اسلامی لٹریچر میں کچھ ایسی روایات راہ پا گئی ہیں جن سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں بے ادبی ہوتی ہے۔ اور مستشرقین ان کو سند بنا کر اسلام کے خلاف اعتراضات کرنے کا موقع حاصل کرتے ہیں۔ مولانا نے مشورہ دیا کہ ان روایات کو اسلامی لٹریچر میں سے حذف کر دینا چاہئے۔

ہم نہیں سمجھ سکے کہ جب مولانا غلام مرشد اس قسم کا مشورہ دے رہے تھے تو وہ ہوش و حواس میں تھے یا ماحول کی سحر انگیزی نے ان پر نشے کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ اس امر سے قطع نظر کہ اس قسم کے کسی اقدام کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ مسئلہ ایک علمی مسئلہ ہے۔ جسے اہل علم کی کسی مجلس میں بیان کیا جانا چاہیے۔ یا کہ یہ ایک عوامی مسئلہ ہے جسے عوام کی حمایت حاصل کر کے حل کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک علمی مسئلہ ہے۔ اور انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ ہرگز اس کے تذکرے کے لیے موزوں نہ تھا۔ اور اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی آڑ میں "انکارِ حدیث" کے فتنے کی حمایت کی جائے۔ بے چارے عوام کو کیا

معلوم کہ اسلامی لٹریچر میں جن عیوب و نقائص کی نشاندہی کی جارہی ہے۔ ان کا کوئی وجود ہی نہیں۔ اور مستشرقین کے اعتراضات کا ہدف ضعیف روائتیں نہیں بلکہ خود اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ہے۔ یورپ کے پادریوں اور یہودی عالموں نے اسلام پر جو اعتراضات کیے ہیں وہ اس لیے نہیں کہ ان اعتراضات کا کوئی محل ہے۔ بلکہ ان کی غرض یہ ہے کہ مسیحی اقوام کو ملتِ اسلامیہ کے خلاف اشتعال دلایا جائے۔ اور انہیں مسلمان ممالک پر تسلط جمانے پر آمادہ کیا جائے۔ اور اس تسلط کے لیے خود مسلمانوں کے اندر ایک احساسِ کہتری پیدا کیا جائے۔ ظاہر کہ اس سیاسی پروپیگنڈے سے مرعوب ہو کر اسلامی لٹریچر کے بارے میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کر لینا کسی باغیرت مسلمان کا کام نہیں ہو سکتا۔ اس کا جواب یہ نہیں کہ ہم اسلام کے خدوخال کی قطع و برید کرنا شروع کر دیں۔ بلکہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مبنی بر حق ہونے کی دلائل فراہم کی جائیں اور جارحانہ حملہ کر کے معترضین کا منہ بند کر دیا جائے۔

پھر دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی لٹریچر کوئی ایسی شئے ہے جو کسی ایک کتاب، گھر میں جمع ہے کہ علمائے اسلام کا کوئی بورڈ بیٹھے۔ اور جس طرح یورپ کے مسیحی علماء کنونشن منعقد کرتے تھے۔ اور بائیبل کا ترجمہ کر کے اپنی مرضی کے مطابق اس میں مطالب شامل کر دیتے تھے۔ وہ بھی اسلامی لٹریچر میں حسبِ منشا ,, اصلاح و ترجمہ ،، روبہ عمل لائے۔ اس کے بعد وہ سارے باقی لٹریچر کو نذرِ آتش کر دے اور جب کوئی مستشرق کسی بات پہ اعتراض کرے۔ تو اس سے کہہ دیا جائے کہ دکھاؤ کہاں وہ بات موجود ہے۔ مولانا غلام مرشد ایک وسیع المطالعہ عالم دین ہیں۔ وہ ذرا غور فرمائیں کہ اس قسم کا کوئی اقدام عملاً ممکن ہے؟ اور اگر ممکن نہیں۔ اور چودہ سو برس میں جو لٹریچر تیار ہوا ہے اس پہ

خطِ نسخ پھیرنا عملاً ناممکن ہے تو یہ کہاں کی دانش مندی ہے کہ خود ہی ہتھیار ڈال کر اعتراف کر لیا جائے کہ یہ باتیں مستشرقین کی بے ایمانی کا نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ خود علمائے سلف ہی نے اس کا مواد فراہم کر کے ان کو مہیا کیا ہے۔

مولانا غلام مرشد ہی اندازہ لگائیں کہ وہ اسلام کے حق میں کتنی غلط اور کتنی خطرناک صورتِ حال پیدا کر رہے ہیں۔ اور اگر ان کی (معاف کیا جائے) اس "احمقانہ" تجویز پر عمل کرنے کے لیے فی الواقع کوئی مسلمان قوم تیار ہو جائے تو وہ کفار مستشرقین کی خدمت کرے گی۔ یا اسلام کی عزت قائم کرے گی۔ اس کے بعد تو مسلمانوں پر حجت قائم ہو جائے گی کہ مستشرقین کے اعتراضات درست اور بجا تھے۔ اسی لیے تو مسلمانوں نے اس "بارِ گناہ" کو چھپانے کی کوشش کی۔

اور ہمیں معاف کیا جائے۔ اس قسم کا عذر خواہانہ اور شرم آمیز رویہ اختیار کرنے میں مولانا غلام مرشد نہ تنہا ہیں اور نہ پہلے آدمی ہیں۔ اصل میں یہ ایک چور ہے جس نے ابتداء سے ان اہلِ علم کے قلب و ضمیر میں نقب لگائی ہے۔ جن کے اپنے ایمان و یقین کی دیواریں کمزور اور بوسیدہ تھیں۔ حقیقت میں ان کا اپنا دل تشکیک کے مرض کا شکار ہو چکا تھا۔ غیر مسلم معترضین کا تو محض بہانہ تھا۔ خود ان کا اطمینان اسلام کی تعلیمات کے بارے میں متزلزل ہو چکا تھا۔ لہٰذا جوں ہی کسی غیر مسلم معترض نے قرآن و سنت کے کسی پہلو پر اعتراض کیا۔ انہوں نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔ لیکن چونکہ وہ بہر حال مسلمان رہنا چاہتے تھے۔ اس لیے یا تو انہوں نے تاویل کر کے پیچھا چھڑایا یا پھر اس پہلو کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ قرآن و سنت کے بارے میں تحریف و تاویل اور انکار کے جتنے فتنے اٹھے ہیں۔ اور جن کا قلع قمع کرنے کے لیے ائمہ ہدیٰ نے سر دھڑ کی بازی لگائی ہے

وہ اسی "بے یقینی" کے مارے ہوئے "علماء" کے اٹھائے ہوئے تھے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے زمانے کا فتنۂ خلق قرآن اسی ذہن کا کرشمہ تھا۔ ابوالفضل اور فیضی کا "دینِ الٰہی" اسی کارخانے نے تیار کیا تھا۔ سرسید مرحوم کا علم کلام اسی مرعوب ذہنیت کی پیداوار تھا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی دعوت اسی کا شاخسانہ تھی۔ اور آج انکارِ سنت اور اسلام کی ترمیم اور تحریک و اصلاح کے جو غلغلے سننے میں آتے ہیں وہ اسی "مرض تشکیک" کے انڈے بچے ہیں۔ اقبال مرحوم نے سچ کہا تھا کہ "وہ آدم بے پرواز سب بے یقینی"۔

ہم پورے جزم و یقین اور اذعان کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں۔ اور اس دعوے کے لیے ہمارے پاس ناقابلِ تردید دلائل ہیں کہ اسلامی لٹریچر میں کوئی ایسی بات موجود نہیں جس پر کوئی مومن شرمائے۔ اور اسلامی لٹریچر سے مراد ظاہر ہے کہ وہ لٹریچر ہے جو اہلِ علم کے نزدیک مستند ہے۔ واعظوں کی کہانیاں اور شاعروں کی خرافات نہیں۔ اور مولانا غلام مرشد ہم سے بہتر جانتے ہیں۔ کہ وہ مستند لٹریچر کیا ہے۔ علمائے اسلام ابتدا سے وہ کام کرتے آئے ہیں جس کی فی الحقیقت ضرورت ہے۔ اور اب اگر کسی مزید اقدام کی حاجت ہے تو یہ ہے کہ بجاذبِ نظر اور مدلل طریق پر اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے اور مسلمانوں کو عملاً اسلام کا پابند بنایا جائے۔ اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کو خطرہ کفار و مستشرقین کے اعتراضات سے نہیں بلکہ مسلمانوں کی اپنی بے عملی اور خلافِ اسلام عمل سے۔ اگر کرنے کا کام ہے تو یہ ہے۔[1]

---

[1] طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۶۱ء صفحہ ۷

ان اقتباسات کے پیش کرنے سے ہماری غرض یہ ہے۔ کہ

ان سادہ لوح بزرگوں کی اصلاح پسندی اور ملبوسات دینی کو ڈرائی کلین کرانے کا یہ مشورہ نہایت نقصان دہ ہے۔ مغرب کے نقاد اور آریہ معترضین بھی تو یہی کچھ کہتے آئے ہیں۔ ان کے اعتراضات کا جو دندان شکن جواب علمائے اسلام دیتے رہے ہیں۔ آج کے جدید نقادوں کو بھی اسی نہج پر سنبھالا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ دل میں خدمتِ اسلام کا جذبہ ہو۔ اور نگاہِ تہذیب حاضر کی چمک سے خیرہ نہ ہو گئی ہو۔

منکرین حدیث اپنے نام کے ساتھ منکرین حدیث کا الحاق پسند نہیں کرتے۔ اور اس "ناپسند" کی توجیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ "ہم تو حدیث رسول کے منکر نہیں۔ بلکہ حدیث پر ہماری تنقید کا مقصد یہ ہے کہ جو سرمایہ علمی حضورؐ سے منسوب کیا جاتا ہے وہ ظنی اور ناقابلِ اطمینان ہے اگر کوئی ایسی حدیث مل جائے جو حضورؐ کی ہو تو ہم اسے تسلیم کرتے ہیں۔

اور اس اقرار کے فوراً بعد یہ ارشاد ہوتا ہے کہ حضورؐ کی صحیح احادیث کی تعداد تین چار سے زیادہ نہیں ہے۔"

ظاہر ہے کہ اس وضاحت کے بعد سابقہ اقرار کی کوئی

اہمیت باقی نہیں رہتی۔ حدیث کے ان جدید ناقدین کا یہ انداز نہایت خطرناک ہے۔

ہم نے آئندہ اوراق میں اس بات کی کوشش کی ہے۔ کہ منکرین حدیث کے اکابر کی تصانیف کے حوالے پیش کر کے ان کے غلط طریقِ کار کی نشاندہی کی جائے۔ اور ملک میں اس رُجحان کو رد کرنے کے لیے مسلمانوں کو تا بمقدور خبردار کیا جائے۔

ہم نے منکرین حدیث کی تحریروں کے حوالے دیتے وقت پوری دیانت داری سے کام لیا ہے۔ اور ان حوالہ جات کو ان کے سیاق و سباق کی روشنی میں اچھی طرح سمجھ کر اور ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگا کر اصلی معنوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اگر کہیں ہم ایسا کرنے میں ناکام رہے ہوں تو امید ہے کہ یہ ناکامی سہو و خطا قرار دی جائے گی۔

ہم وعدہ کرتے ہیں کہ منکرین حدیث کی جانب سے پیش کردہ اصلاح کو ہم اس کی صحت کی وضاعت ہو جانے پر قبول کریں گے اور دوسرے ایڈیشن میں اسے بخوشی درج کیا جائے گا۔

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ پرانے منکرینِ حدیث متنازعہ فیہ مسائل

کے حل کے لیے قرآن سے رجوع کرنے کے داعی تھے۔ اور ضرورت پڑنے پر کسی غیر جانب دار ثالث کے تقرر پر کسی نہ کسی طرح رضامند ہو جاتے تھے۔ اگرچہ وُہ اپنی ہٹ دھرمی کی بنا پر ثالث کے فیصلوں کو تسلیم نہیں کرتے تھے تاہم بحث میں دل چسپی رکھنے والے پڑھے لکھے لوگ بآسانی صحیح رائے قائم کر لیتے تھے۔ لہٰذا ان پرانے منکرینِ حدیث کی یہ افتادِ طبع تبلیغی نُقطہ نظر سے قابلِ ستائش تھی [۱]

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "اقبال اور منکرینِ حدیث"

جدید منکرین حدیث

کے

چند پیشرو داعیوں کا اسلحہ خانہ

آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے اسی شہر لاہور سے ایک آواز بلند ہوئی۔ کہ اسلام وہ نہیں جو رائج ہے۔ بلکہ اسلام پورے کا پورا قرآن۔ تنہا قرآن کے اندر موجود ہے۔ یہ ابتدائی قدم تھا۔ بنیادی صداقت کی طرف، لیکن اس میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ لغزشیں تھیں۔ اس کا دعوٰے صحیح، دلائل صحیح، لیکن جو اسلام اس کے داعیوں (داعی اول مولوی عبداللہ چکڑالوی مرحوم) نے پیش کیا۔ وہ بھی مروجہ اسلام ہی کی طرح ایک فرقہ بندانہ کوشش تھی۔ جو نپپ نہ سکی۔ لیکن فضا میں ایک عظیم گونج چھوڑ گئی۔ طبائع میں تجسس پیدا ہو گیا۔ لگ بھگ اس زمانہ میں عظیم آباد پٹنہ میں شمس العلماء مولانا محب الحق عظیم آبادی نے ایک سلسلۂ تصانیف شروع کیا۔ جس کی تکمیل شرعۃ الحق، بلاغ الحق نام کی دو کتابوں پر ہوئی۔ جن میں پوری سنجیدگی اور عبور و تبحر کے ساتھ ثابت کیا۔ کہ مسلمانوں کی عالمگیر بربادیوں کی ذمہ دار وہ متضاد حدیثیں ہیں۔ جن پر ہر فرقہ ایک دوسرے سے الجھنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ اور کامل دین صرف قرآن میں ہے۔ یہی نعرہ دہلی جامعہ ملیہ سے حضرت مولانا حافظ محمد اسلم مدظلہ جیراج پوری نے بلند کیا۔ آپ کا لہجہ حد درجہ متین و مدلل ہے۔ بہار ہی کے ایک دوسرے بزرگ علامہ تمنا عمادی مدظلہ بھی اس میدان کے شہسوار ہیں۔ اس متبرک صف میں صرف آپ ہی ہیں۔ جو باوجود پیرانہ سالی کے اب تک خدمتِ قرآن کر رہے ہیں۔ پنجاب کے

تجارتی مرکز امرتسر مرحوم میں یہ کام اللہ تعالیٰ نے خواجہ احمد الدینؒ اور ان کے مخلص رفقاء سے لیا۔ مولٰنا اسلم کا لگایا ہوا بیج ماہنامہ طلوع اسلام کی شکل کراچی میں پھل پھول رہا ہے۔ اور خواجہ احمد الدین مرحوم کی روح جریدہ البیان، لاہور میں کام کر رہی ہے۔ یہ وہی البیان جس نے "دو اسلام" کے مصنف کی حیرت انگیز تبلیغی تصنیف "دو قرآن" کو مسلسل قوم کے سامنے پیش کیا"۔ سلہ (مدیر البیان)

رسالہ البیان کے مدیر کا یہ اقرار ہماری خاص توجہ کا طالب ہے۔ گویا

(۱) مولوی عبد اللہ چکڑالوی۔ ۲۔ مولوی محب الحق عظیم آبادی۔ ۳۔ مولٰنا محمد اسلم جیراجپوری۔ ۴۔ تمنا عمادی۔ ۵۔ خواجہ احمد الدین۔ ۶۔ غلام احمد پرویز (مدیر طلوع اسلام)۔ ۷۔ قمر الدین قمر (مدیر البیان)۔ ۸۔ غلام جیلانی برق۔ انکار حدیث کے علمبرداروں میں نمایاں شخصیتیں ہیں۔ اس فہرست میں مدیر البیان نے نگار کے مدیر نیاز صاحب فتح پوری کو کیوں شامل نہیں کیا۔ یہ "سہو" و "خطا" یہ اعراض کیوں؟

حقیقت یوں ہے کہ جدید منکرین حدیث نیاز فتح پوری کے حلقہ نیاز کے پروردہ ہونے کے باوجود ان کا ذکر خیر اس لیے نظر انداز کر جاتے ہیں۔ کہ وہ ان کی طرح گندم نما جو فروش نہیں تھے۔ وہ اپنے عقاید کا اظہار بہانگ دہل کرتے تھے۔ وہ خدا کے منکر تھے۔ قرآن سے بے نیاز تھے۔ مذہب کو حرف غلط کی طرح مٹانا چاہتے تھے۔ دنیا کے ہر نظام سے اشتراکیت کے نظام کو اعلیٰ سمجھتے تھے۔ اور اس کا اعلان کرتے تھے۔ انہیں دل کی بات چھپانے کی اتنی مہارت نہیں تھی۔ جتنی جدید منکرین حدیث کو ہے۔ وہ حدیث کے بھی منکر تھے۔ اور قرآن کے بھی۔ اُن میں اور اِن میں فرق صرف اتنا ہے۔ کہ وہ قرآن کو رسول اللہؐ کا کلام

سلہ "دو اسلام" ص ۳۰ - ۳۱

کہتے تھے۔ اور حدیث کو اسی طرح رفتہ بے معنی گردانتے تھے۔ یہ بزرگوار حدیث کو ظنی کہتے ہیں۔ اور قرآن کے معانی جدید لغت سے نکالتے ہیں۔ نتیجہ سب کرم فرماؤں کا ایک سا ہے۔ اس دور کے دوسرے منکرین حدیث عبد اللہ چکڑالوی صاحب، مولانا حشمت علی صاحب، خواجہ احمد الدین صاحب نے بھی اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے میں مقابلتاً دلیری سے کام لیا ہے۔ لہٰذا مدیر البیان ان کا پورا پورا ہمنوا نہیں۔ اور صرف اتنا سا فقرہ دیتا ہے۔ کہ ان کا دعویٰ صحیح اور دلائل صحیح تھے۔

اس طرح یہ جملہ داعیان دو حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ اس طرح ان کے کارناموں کے مطالعہ میں آسانی ہو گی۔

۱۔ مولوی عبد اللہ چکڑالوی صاحب۔ ۲۔ محب الحق صاحب عظیم آبادی۔ ۳۔ علامہ تمنا عمادی صاحب۔ ۴۔ خواجہ احمد دین صاحب۔ ۵۔ نیاز فتح پوری۔ ۶۔ سید مقبول احمد صاحب۔

حافظ محب الحق صاحب

حافظ محب الحق صاحب مرحوم حدیث کے منکر تھے۔ مگر تمام مسلم و متفق علیہ فرائض و واجبات کو قرآن مجید سے مستنبط کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ کسی مسلم و متفق علیہ اسلامی شعائر کے منکر نہیں تھے۔ یہی حال اکثر مسائل میں ان کے صحبت یافتہ جناب تمنا عمادی پھلواروی کا ہے۔ مولوی سید محی الدین صاحب، تمنا عمادی مجیبی پھلواروی، پھلواری کی خانقاہی سیاست میں پھنس کر پہلے خانقاہ مجیبیہ پھلواری کے حریف ہوئے۔ پھر نفسی تصوف کے دشمن، اس کے بعد ایصالِ ثواب کا انکار کیا۔ پھر جمع قرآن کی تمام

روایات کا انکار کر بیٹھے - یہ ترقی معکوس آخر انہیں اس مقام پر لے آئی - جہاں سے عام منکرین حدیث اپنا سفر شروع کرتے ہیں - ان منکرین میں بعضے بعضے رسول کو شارع مانتے ہیں - مگر روایت کی صحت کے منکر ہیں سنت متواترہ پیش کی جاتی ہے - تو کچھ دیر کے لیے سر خم کر دیتے ہیں - ہمارے مولانا تمنا عمادی کا چھ سات برس پہلے تک یہی حال تھا - نگار کے مقالہ نگار، حق گو، بھی حضرت سید صاحب قبلہ کی تبلیغ و تلقین سے آخر میں اس مقام پر آ گئے تھے - مگر ان کی بڑی تعداد (خاکم بدہن) نبی کو ڈاکیہ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتی،، ؎۱

تمنا عمادی صاحب کی نگارشات ــــ "حق گو،، صاحب یعنی سید مقبول احمد صاحب کی کتاب مطالعہ حدیث کے صفحات ۱۰۰-۱۰۵، (مضمون متعلق دجال) ۲۲۰-۲۲۶ (ایصال ثواب) ۲۳۰-۲۵۰ (التاریخ المستند لمسند الامام احمد) ۲۶۷-۲۸۴ (علم وصیت و قانون وراثت) پر پھیلی ہوئی ہیں - ان کا اسلوب دوسرے منکرین سے ہم آہنگ سا ہے -

جدید منکرین کے ہاں ان کی تنقید کی صدائے بازگشت موجود ہے - پرویز صاحب نے قانون وراثت پر بحث کرتے ہوئے اپنے اس امام کے خیالات سے کافی فائدہ اٹھایا ہے - تمنا صاحب کے "ارشادات،، کا نی کمہ اتنا سود مند نہیں ہے - جتنا کہ ان کے پیروؤں کے انکار کا - لہذا ہم جدید منکرین کے افکار پر بحث کرتے وقت قدیم منکرین حدیث کے جواہر پاروں کو بھی پیش نظر رکھیں گے -

یہ دائی ــــــ (بقیہ منکرین اگلی پیشی رکھے بغیر حدیث کا انکار کرتے ہیں۔

؎۱ سنت رسول تعارف از مسعود عالم [illegible]

۱۔ محمد اسلم جیراجپوری ۔ ۲ ۔ قمر الدین صاحب قمر ۔ ۳ ۔ غلام جیلانی برق ۔ ۴ ۔ غلام احمد صاحب پرویز ۔ نیز ان کے رفقاء کار ـــــــــ یہ کرم فرما مقابلۃً مصلحت کوشش ہیں ـــ ان میں اسلم صاحب موصوف اور غلام احمد پرویز صاحب ۔ یعنی استاد اور شاگرد دونوں ۔ الفاظ کی قدر و قیمت سے آگاہ ، ابہام پیدا کرنے میں ماہر ، تاویل کے شہنشاہ ، تحریف کے خداوند ۔ حالات کے نباض بے بدل ، باہمت اور محنت کش ہیں ۔ انہیں ملتِ اسلامیہ کے جذبات کے ایک ایک موڑ سے آگہی ہے ۔ لہذا ان کی تحریریں زیادہ غور طلب ۔ اور ان کے حملے سنتِ نبوی کے قلعہ عالیہ کے سبب نہایت نقصان دہ ہیں ۔

اب ہم قدیم منکرین کے چند حملوں کی سرگذشت بیان کرتے ہیں ۔ اس پیشکش کے دوران ہی میں یہ بات بھی واضح ہو جائے گی ۔ کہ نیاز صاحب فتح پوری کے ساتھ قدیم و جدید منکرین حدیث کو نیازمندی ہے یا نہیں ہے ۔

مولوی عبد اللہ صاحب چکڑالوی اور خواجہ احمد الدین صاحب ۔ اس وقت کے علماء کے ساتھ مناظروں میں جس طرح ناکامی سے ہمکنار ہوئے ہیں ۔ اس کا مختصر سا حال ہم "اقبال اور منکرینِ حدیث" میں بیان کر آئے ہیں ۔ لہذا اس کا اعادہ بے سود ہے ۔ ـــــ

محب الحق صاحب عظیم آبادی اور علامہ تمنا عمادی کے جواہر پاروں کو طلوعِ اسلام اور البیان میں استعمال کیا جا رہا ہے ۔ لہذا طلوعِ اسلام کے کارنامے گناتے وقت گویا ہم ان گذشتہ صلحاء کے کارنامے ہی گنا رہے ہوں گے ـــ نیاز صاحب کہ نیاز آپ متعلقہ باب میں حاصل کر چکے ہیں ۔ لہذا ہم سردست سید صاحب مقبول احمد کے مسودات سے بحث کریں گے ۔

نماز:۔

نماز کو عربی میں صلوٰۃ کہتے ہیں۔ نماز عجمی لفظ ہے۔ اور اس کی اور سنسکرت کے الفاظ نمسکار کی ایک ہی اصلیت ہے۔ صلوٰۃ کے لفظی معنی کیا ہیں۔ اس میں بہت اختلاف ہے۔ بعضوں کی رائے ہے کہ صلوٰۃ صلوین یعنی چوتڑوں کے ہلانے کے معنی میں آتا ہے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ صلوٰۃ کے معنی دعا اور درود کے ہیں۔ بعضوں نے کہا ہے۔ کہ صلوٰۃ کے معنی کسی طرف جھکنا ہے۔ یا اونٹ کی نشست ہے۔ لیکن درحقیقت یہ لفظ عربی کا نہیں ہے۔ بلکہ اسودی ہے۔ جس کے معنی بھیک مانگنا ہے۔ اور عبرانی میں صلوٰۃ کی اصطلاح نماز کے لیے ہے۔ گویا کہ موجودہ یہود میں یہ لفظ مستعمل نہیں ہے۔ قرآن میں نماز کی تعدیل و ترکیب و ترتیب کا ذکر نہیں۔ سوائے اس کے کہ آیہ صلوٰۃ خوف میں ایک اشارہ اس بات کا پایا جاتا ہے۔ کہ نماز میں پہلے کھڑے ہوتے تھے۔ اور سجدے کے بعد ختم کر دیتے تھے۔ قرآن کی دوسری آیتوں میں رکوع، قیام، سجدہ کا ذکر بھی آیا ہے۔ مگر التحیات، سلام و دعا کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ مگر یہ بالکل صحیح ہے کہ رسول اللہ صلعم نے نماز کو ایک خاص طریقہ سے پڑھا ہے۔ اور چونکہ آپ کا یہ ایک مشہور و ظاہر فعل تھا۔ یہ بالکل قرین قیاس ہے۔ کہ کثرت سے رسول اللہ صلعم کی نماز میں لوگوں نے اقتدا کی۔ پھر اخلاف سے اسلاف کو دیکھا۔ اور یہ ناممکن ہے کہ سلسلہ بہ سلسلہ وہ طریقہ جاری نہ رہتا۔ اور بھلا دیا جاتا۔ غالباً اسی واسطے قرآن شریف نے نماز پڑھنے کی ترکیب کو مفصل بیان نہیں کیا۔ کیونکہ اس کی سنت متواترہ سے ضرورت باقی نہ رہتی تھی۔ اور اس میں یہ مصلحت تھی کہ

قوموں کے اختلاف، عادات و معاشرت میں قرآن کا ایک خاص طریقہ کو فرض کر دینا یا اس پر اصرار کرنا مناسب نہ تھا۔" [۱]

گویا ان کے نزدیک مختلف العادات اقوام نماز کی ترکیب و ترتیب میں بھی فرق کر سکتی ہیں۔

"قرآن سے جو اوقات نماز واضح ہیں۔ وہ صرف فجر، عصر اور عشاء کی نماز ہے۔ ظہر اور مغرب کا کہیں ذکر نہیں۔ اور یوں بھی درحقیقت ظہر اور مغرب کوئی وقت نہیں بلکہ محض اوقات عصر و عشاء میں تقدیم و تاخیر سے پیدا ہوتا ہے۔" [۲]

"وہ (زنادقہ) مسلمانوں کو معاشرتی اور کاروباری ترقی سے محروم کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کے ساتھ اسلام کو ایک سخت و ناقابل عمل مذہب دکھلا کر عوام کو اس سے سرگشتہ کرنا چاہتے تھے۔ مجھے یہاں اس کا ذکر کر دینا چاہیئے۔ کہ بعض مستشرقین کا گمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اوقات صلوٰۃ میں پانچ وقت کی تعین کو مجوس سے سیکھا۔ فون کریمر، اور گولڈ زیہر کی یہی رائے ہے۔ مگر ان دونوں جرمنوں کا یہ وہم و گمان ہے۔ جیسا کہ میں نے قرآن سے دکھایا ہے۔ قرآن کی کسی آیت سے پانچ وقت کی نماز ثابت نہیں ہوتی ...... ہاں یہ ضرور ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں بلکہ ان فقہا نے جو مجوس کے ساتھ عراق و عجم میں تھے۔ انہوں نے مسابقت کے خیال سے اپنی عبادتوں کو مجوس سے کم پسند نہ کیا۔ اور اوقات صلوٰۃ میں حدیثیں وضع کی گئیں۔" [۳]

---

[۱] مطالعہ حدیث ص ۱۴۷۔ [۲] ایضاً ص ۱۴۹

[۳] ایضاً ص ۱۴۹ — ۱۵۰

جب ارکان کے ادا کرنے اور ترتیب کو قرآن سے ثابت نہ کر سکے تو یہ مان لیا کہ سنت متواترہ کی رو سے یہ طریقہ درست ہے۔ لیکن تعداد کو چونکہ ناپسند کرتے تھے۔ لہذا یہاں سنت متواترہ کو قبول نہیں کیا۔ اور پانچ وقتوں کو فقہا کی اختراع قرار دے کر جرمن مستشرق کے اعتراضات سے بھی رہائی پائی۔ اور مسلمانوں کو کام کرنے کے لیے وقت بھی عنایت فرمادیا۔ اور قرآن کی ہمنوائی کی سعادت بھی لے لی۔ اس سے بڑھ کر اجتہاد و تعمق کا نمونہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ یہ نعرہ لگاتے رہتے ہیں کہ حدیث وہی صحیح ہے جو قرآن کے موافق ہو۔ اس موافقت قرآن سے مراد ان لوگوں کی یہی ہوتی ہے کہ قرآن کی کسی آیت کے جو معنی یہ کریں حدیث ان معانی کی تائید کرتی ہو۔ تو موافق قرآن ورنہ وضعی۔ اب یہ موافقت قرآن کی موافقت ہوئی یا منکرین حدیث کی۔ چونکہ یہ صاحب نماز کی تعداد تین بتاتے ہیں۔ لہذا تحقیق ذیل ملاحظہ ہو:۔

"نماز پنجگانہ اسلام میں کیونکر پیدا ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ اس کی ابتدا اس وقت ہوئی جب معراج کی حدیث وضع ہوئی۔ یعنی ساتویں صدی ہجری میں حدیث میں صلوٰۃ خمسہ کی تائید میں اول تو وہی روایت ہے۔ جو میں معراج کے عنوان میں بیان کر چکا ہوں۔ ایک روایت میں یہ کہا جاتا ہے۔ کہ حضرت جبرئیل پانچ وقت آکر رسول اللہ صلعم کے ساتھ نماز پڑھ گئے تھے۔ مگر ازبسکہ جبرئیل کا دیکھنے والا رسول اللہ صلعم کی ذات کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو ہو سکتا۔ یہ روایت سماعی ہو جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور آپ نے اس کے سامنے پانچ وقت نمازیں پڑھ کر دکھلائیں۔ مگر یہ حدیثیں کچھ بھی قابل یقین نہیں۔ صرف اس لیے کہ وہ مخالف قرآن ہیں۔"۔ [1]

---

[1] ایضاً ص ۱۵۵

کس قرآن کے مخالف ہیں۔ اس فہم قرآن کے جو منکر حدیث کو درست نظر آیا ہے۔

" جمعہ کی نماز ایک علیحدہ وقت میں ایک خاص دن فرض کی گئی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ وہ وقت ہوگا۔ جبکہ اس وقت کوئی نماز نہ پڑھی جاتی ہو گی "

اس طرح یہ صاحب صرف ایک دن (جمعہ) کے لیے ظہر کی نماز کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور انہیں یہ خیال نہیں کہ نماز جمعہ کے لیے ظہر کا وقت بھی تو حدیث اور تواتر کی رو سے متعین ہے۔ قرآن میں کہیں، جمعہ کے لیے ظہر کا وقت مقرر نہیں ہے۔ اس لیے منکر حدیث کو یہ حق کیسے پہنچ سکتا ہے۔ کہ وہ حدیث کی رو سے مقررہ وقت کو صرف ایک دن کے لیے تو تسلیم کرلے۔ اور باقی چھ دنوں کا تعین نہ مانے۔ یا تو سب کا انکار کرنا چاہیے یا سب کا اقرار۔

اوقاتِ صلوٰۃ کے عنوان سے مقبول احمد صاحب نے۔ اس مضمون (۱۴۶-۱۶۳) میں یہ کوشش کی ہے۔ کہ نماز کے اوقات[1] کم سے کم کر کے ۳ کر دیئے جائیں۔ معارف میں ان کے مضمون پر جب تنقید کی گئی تو انہوں نے اپنی پوزیشن یوں واضح کی۔

" میری گذارش یہ ہے کہ ۵ وقت کی بجائے ۵۰ وقت کی نماز پڑھیے۔ چشمِ ماروشن دلِ ماشاد۔ کافر ہے جو نماز کی اہمیت پر یا کثرت عبادت کی خوبی پر کلام کرے۔ میرا سوال تو یہ تھا کہ قرآن کی کس آیت سے پانچ وقت کی نماز ثابت ہوتی ہے "[2]

اس کتاب کے دیباچے میں ان کے پیر صاحب اسلم جیراجپوری لکھتے ہیں:-

" آپ نے جو باتیں لکھی ہیں۔ وہ اگرچہ دلچسپ ہیں۔ اور ان سے بہت کچھ حدیث کی

---

[1] صفحہ ۱۵۹ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں۔ ان تینوں میں سے بھی ایک یعنی رات کی نماز بحکم قرآن نافلہ ہے۔ [2] ایضاً ص ۱۵۹۔

اصلیت پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن بعض جزئیات میں آپ کے ساتھ اتفاق کرنے کے وجوہ ناکافی ہیں۔ بالخصوص تعداد ایام صیام اور اوقات صلوٰۃ میں۔ لیکن یہ اختلاف میرا ایک اصول پر مبنی ہے۔ یعنی میں اسوہ رسول کو دین مانتا ہوں۔ جو عمل متواتر کی صورت میں ہم تک پہنچا ہے۔ اور اس میں صلوٰۃ پنجگانہ اور روزے پورے مہینہ کے ہیں۔" [1]

اسلم صاحب دانا ہیں۔ اور مقبول احمد صاحب جوشیلے اور "حق گو"۔ اس اقرار کے باوجود اسلم صاحب کا یہ ارشاد ملاحظہ کیجئے۔ "وقت پانچ۔ لیکن نماز میں جو پڑھا جاتا ہے۔ وہ الحاقی ہے۔

"سادات نے نمازوں کے اندر درود میں اپنا حق قائم کر لیا۔ میں کبھی قیاس نہیں کر سکتا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ مروجہ درود جو نمازوں میں پڑھا جاتا ہے۔ پڑھتے رہے ہوں۔ یا اس کے پڑھنے کی کسی کو ہدایت کی ہو۔ کیونکہ یہ خاندان پرستی ہے۔ جس سے اسلام کا دامن بالکل پاک ہے۔" [2]

اس کے بعد انہوں نے لفظ آل پر اختصار کے ساتھ اظہار رائے فرمایا ہے۔ اور جو لوگ آل کے معنی تمام امت کے لیتے ہیں۔ انہیں سادہ دل لوگ کہہ کر آگے نکل گئے ہیں۔ دیکھئے یہ منکرین حدیث کیسے نماز کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں۔ جناب مصنف لکھتے ہیں:۔

"بلغاریہ کے نومسلم جو پاک کہلاتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر ایسے بدبخت ہیں۔ جنہوں نے عملاً اسلام کو ترک کر دیا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ ان میں سے پانچ وقت کی نماز خصوصاً ظہر و مغرب ادا نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے بہت کوشش کی کہ بلغاری حکومت

---

[1] ایضاً ص[illegible] [2] ایضاً ص[illegible]

ان کو فیکٹریوں، سکولوں اور دفاتر میں نماز ظہر کی چھٹی دے ۔ .... اس طرح جب دنیا کا کام نہ چلا تو انہوں نے اسلام ہی کو چھوڑ دیا"۔ [۱]

لہٰذا مقبول احمد صاحب قرآن سے صرف تین نمازیں ضروری ثابت کرتے ہیں تاکہ اس ملک کے لوگ بھی کہیں "گمراہ" نہ ہو جائیں۔

ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

ان کا مضمون "ایام صیام" (۱۶۴ — ۱۷۶) نہایت دلچسپ اور مضحکہ خیز ہے۔ انہوں نے انتہائی کوشش اس بات کو ثابت کرنے میں صرف کی ہے۔ کہ روزوں کی تعداد تین ہے۔ معلوم نہیں تثلیث سے انہیں اتنی محبت کیوں ہے۔ نمازیں تین۔ روزے تین۔ یہ دلچسپی اُنکے چند یاران میکدہ کے ہاں کم ہو کر دو تک محدود ہو گئی ہے۔ دو قرآن، دو اسلام، وغیرہ —— لکھتے ہیں :-

"ایاما معدودات کا اشارہ ثابت کر رہا ہے کہ روزے دس دن سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ اور اس لیے درحقیقت روزے جو مسلمانوں پر قرآن کی رو سے فرض معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ۲۱ رمضان سے ۲۹ رمضان یا صبح عید تک ہیں۔ اس میں بعض اعتکاف کرتے ہیں۔ اور بعض روزے پر اکتفا کرتے ہیں۔ رمضان کے بقیہ روزے نوافل کا درجہ رکھتے ہیں ..... حدیث سے تین دن کے روزے ثابت ہیں"۔

جب ان کے یہ ارشادات روشنی میں آئے۔ تو ان کی اپنی پارٹی ہی سے ایک بزرگ مفتی محمد دین صاحب وکیل گجرات نے ان کو ٹوکا۔ جس پر یہ صاحب بہت زیادہ ناراض ہوئے۔ بہر حال ہمیں ان بھائیوں کی بحث سے کوئی غرض نہیں۔ البتہ اتنا ضرور واضح ہوتا ہے۔ کہ

---

[۱] ایضاً ص ۱۴۱

منکرین حدیث کو اپنی پیدائش کے پہلے ہی چند سالوں میں اختلاف کا شکار ہونا پڑا۔ اور جس اختلاف کو وہ احادیث کے سر تھوپتے تھے۔ وہ ان کی قرآن فہمی کے ذمّہ بھی پڑ گیا۔

دورِ اوّل کے منکرین، روزوں کے بیان میں دنوں کی کمی بیشی پر زور دیتے تھے۔ جب ان کا یہ حملہ مسلمانوں کے اعتقاد کو متزلزل نہ کر سکا۔ تو ان کے جانشینوں نے حملہ کا رخ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰت سے بدل کر یُطِیْقُوْنَہٗ کی طرف کر دیا۔ اور روزے رکھنے کی طاقت اور فدیہ کی بحث میں وہ رنگینی پیدا کی کہ تساہل پسند طبیعت کے لیے ان کی اپیل میں جان پیدا ہو گئی۔ اور یہی ان کا مقصود تھا۔ اب تعداد تیس کی تیس ہی رہ گئی۔ مگر اس تعداد یوم میں روزہ نہ رکھنے والوں کی فہرست تمام مسلمانوں کو محیط ہو گئی۔ زبانی زبانی روزے رہ گئے۔ اور ان سے چھٹی بھی مل گئی ——— (بحث صیام مندرجہ باب ——— ملاحظہ ہو)

زکوٰۃ

برق صاحب اور پرویز صاحب کے ارشادات اس موضوع پر آپ پڑھ آئے ہیں۔ اب مقبول احمد صاحب کے تُرشِ مودات سنئے:-

" فرض کرو ایک شخص کے پاس خیرات کرنے کو مال ہے۔ مگر فقہ کی رو سے اس پر نصاب ابھی واجب نہیں۔ یا وہ ایسی ترکیب کرتا ہے۔ کہ اس پر کبھی واجب نہ ہو گی۔ تم ایسے شخص سے کیونکر خیرات کی توقع رکھ سکتے ہو۔ حالانکہ خیرات تو یہ تھی کہ اس زکوٰۃ کا مفہوم وہی بتایا جاتا۔ جس کے لیے نصاب و وقت کی کوئی قید نہ ہو۔ زکوٰۃ نماز کی طرح ایک فرض روزانہ ہے عیسائیوں میں ہر اتوار کو جب نماز ختم ہو جاتی ہے۔ تو زکوٰۃ جمع کی جاتی ہے۔ اور وہ نیک

کاموں میں خرچ کرنے کے لیے گرجے میں جمع رہتی ہے - کیا اس میں اَقِیمُوا الصَّلوٰۃَ وَاٰتُوا الزَّکوٰۃَ کی بو نہیں آتی - کیا تم بھی نماز جمعہ پڑھ کر ایک آدھ روپیہ زکوٰۃ کا نہیں نکال سکتے - مگر تم نے اپنی روایت پرستی کے آگے قرآن کے صاف وصریح حکم کو پس پُشت ڈال دیا" ے۱

بندہ پرور! نادان ہیں - کیا کریں —— بقول آپ کے استاد نیاز صاحب کے مسجدوں میں جمع ہونے والے حیوان ہوتے ہیں - آپ سے ایسی دانشمندی کا سبق نہیں لے سکتے - اور عیسائیوں کی ریس نہیں کر سکتے -

برق صاحب بھی زکوٰۃ کے وقت کے تعین کے خلاف ہیں - اور اسے عام خیرات ہی سمجھتے ہیں - مگر مقبول احمد صاحب عیسائیوں سے مشابہت کا بیان کر گئے ہیں — اور وہ مصلحتاً ان کا نام نہیں لیتے -

قربانی و حج :-

دنیا کی مختلف اقوام کے ہاں قربانی کی رسومات کا بیان کرنے کے بعد کوئی عرشی صاحب فرش والوں کو ہدایت دیتے ہیں :-

"ہمارا دعوے ہے - اور کامل وثوق ویقین کے ساتھ دعوے ہے - کہ جس طرح قرآن مجید نے سابق رسوم واطوار کو اعتدال واصلاح سے نتیجہ بخش صورت میں پیش کیا - اسی طرح قربانی کو بھی وہم واسراف کی پستیوں سے نکال کر روحانی، عقلی اور اقتصادی فوائد سے معمور کر دیا" ے۲

ے۱ مطالعہ حدیث ص ۱۹۹ ے۲ ایضاً ص ۲۰۵

ٹھیک ہے۔ عرشی صاحب! اسلام اعتدال پسند ہے۔ آپ کا پہلا وار لطیف اور شیریں ہے

" کیا ہم ہر سال اطرافِ عالم میں کروڑوں جانوروں کو بے ضرورت کاٹ کر ضائع نہیں کرتے۔ اور بالخصوص مکہ معظمہ میں لاکھوں جانوروں کو کاٹ کاٹ کر گڑھوں میں نہیں پھینکتے۔ کیا یہ اہلاک نسل نہیں ہے۔ کیا ہم قرآن کے مذکورہ الصدر فتویٰ کے مستوجب نہیں۔ کیا ہم واللہ لا یحب الفساد کے اٹل قانون کے ماتحت خدا کی نگاہ میں محبت سے محروم نہیں ہو گئے۔" ؎

گویا قربانی اسراف بھی ہے۔ اور فساد بھی۔ جب آپ جدید منکرین کی رائے اس ضمن میں ملاحظہ کریں گے۔ تو آپ کو فساد کا لفظ نہیں ملے گا۔ اس لیے کہ جدید حضرات زیادہ دانائی کے ساتھ عمل پیرا ہیں۔ اور وہ سلیقہ کے ساتھ شعائر اسلام کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ان کے یہ پیشرو جو شیلے تھے۔ اس واسطے ان صاحب کی مخالفت عام اور شدید ہو گئی تھی۔

اب عرشی صاحب کے مضمون پر مقبول احمد صاحب کا تتمہ دیکھئے۔

" یہ کہنا نادانی ہے کہ حج اسلام میں ایک وقت معین پر فرض کیا گیا۔ حج کی رسم حضرت ابراہیم کے وقت سے چلی آتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں بھی اس کا اظہار ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ رسم حج اسلام میں بھی باقی رکھی گئی۔ جانوروں کا بے ضرورت مکہ میں ذبح کرنا نہ واجب ہے۔ نہ مسنون۔ اور نہ یہ کوئی نیکی ہے۔ اس لیے تمام ایسی حدیثیں جن میں نفس قربانی یا ذبیحہ کرنے کی اور کار ثواب بتایا گیا ہے۔ وہ میرے

؎ ایضاً ص ۲۰۹

نزدیک موضوع اور باطل ہیں .... یہ کہنا کہ رسول اللہ نے مدینہ میں بقر عید منائی ہے اور قربانی کی ہے۔ تو اس روایت کو مان لیا جائے تو اس کا واجب ہونا کہاں سے ٹھہرا۔ رسول کا ہر فعل مسلمان کے لیے واجب نہیں ہو سکتا۔ ان کی بہت سی قومی رسمیں تھیں۔ جو عرب ہونے کی حیثیت سے وہ کرتے تھے۔ مثلاً عقیقہ عرب کی رسم تھی اور ممکن ہے کہ رسول اللہ نے بھی کیا ہو۔ مگر نہ وہ ہمارے لیے واجب ہے نہ سنت۔ کرے نہ کرے " سلہ

بقر عید کا نام لے کر قربانی کے فساد ہونے پر فتوے دینا کس درجہ نادانی اور ابلہ فریبی ہے۔ اگر یہ شعائر اسلام رسم تھے۔ تو نماز روزہ کو کیوں رسم نہیں کہتے۔ شاید قرآن میں ان کے ذکر کی بدولت انکار کرنے میں خاموشی ہے۔۔۔ حالانکہ ان کے پیرو مرشد نیاز صاحب تو ببانگ دہل ہر اسلامی فرض و سنت کو فضول سمجھتے ہیں۔

یہ ممکن ہے کہ جدید منکرین نیاز صاحب سے اپنے تعلق کو وقت کی مصلحت کے ماتحت تسلیم نہ کرتے ہوں۔ ان کی تردید کے لیے ہم اس کتاب کے ابتدائیہ سے چند سطریں پیش کرتے ہیں۔

" ان مضامین کا زیادہ حصہ نگار میں مختلف اوقات میں شائع ہوا تھا۔ اور اب احباب کے پیہم اصرار سے اس سلسلہ مضامین کو جو نگار میں شائع ہو چکے تھے اور جو باقی رہ گئے تھے۔ نظر ثانی، حذف و اضافہ کے ساتھ۔ کتابی صورت میں جمع کر کے پیش کرتا ہوں۔ میرا مدعا اس قسم کی تحریر سے نہ ذاتی نام و نمود ہے۔ نہ

سلہ ایضاً ص ۲۱۵ - ۲۱۶

مولویوں سے ہنگامہ آرائی۔" ؎۱

اس کتاب پر جدید منکرین حدیث کے امام محمد اسلم جیراجپوری کے تصدیقی دستخط ملاحظہ کیجئے۔

"جناب سید مقبول احمد صاحب مولف مطالعہ حدیث کا مسودہ جناب مولانا اسلم صاحب جیراجپوری کی خدمت میں برائے تنقید بھیجا تھا۔" (ناشر کتاب) صفحہ ۵۔

اس پر اسلم صاحب نے نہایت مفید مشورے دیئے ہیں۔ اور ان کی فرد گذاشتوں کی اصلاح کی ہے۔ اور حملہ کے اچھوتے زاویے سمجھائے ہیں۔

"مطالعہ حدیث میں نے غور سے مطالعہ کی۔ کتاب چھوٹی، مضامین متعدد۔ پھر ہر ایک مضمون میں تخریبی اور تعمیری دونوں پہلو۔ ان وجوہ سے بحثیں مختصر اور تشنہ رہ گئیں۔ دلائل میں آیات سے کم اور روایات سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ اور یہ وہ ہتھیار ہے۔ کہ جس سے آپ کے حریف بہ نسبت آپ کے زیادہ مسلح ہیں۔" ؎۲

بارہ صفحوں میں اسلم صاحب نے انہیں جدید اور عمدہ ہتھیاروں کے استعمال کا طریقہ بتایا ہے۔ سید مقبول احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر رہ چکے تھے۔ اور نگار کے دست راست تھے۔

سید مقبول احمد صاحب نے "حق گو" کے نام پر ایک رسالہ بعنوان "میں منکر حدیث کیوں ہوا" ۱۹۳۴ء میں امرتسر سے شائع کیا تھا۔ اس میں انہوں نے حدیث پر جو اعتراضات کیے تھے۔ وہ کم و بیش وہی ہیں۔ جو ان کی کتاب زیر نظر میں ہیں

؎۱ ایضاً ص ۱۳ تمہید۔ ؎۲ مطالعہ حدیث ص ۵

اسلم جیراج پوری

بیسویں صدی عیسوی کے ان تخریب پسندوں کی جنہوں نے مذہب اسلام کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو ان کرم فرماؤں میں مولانا محمد اسلم جیراج پوری کو امت مسلمہ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ اسلم صاحب ہی وہ پہلے منکرِ حدیث ہیں، جنہوں نے سنت کے مرکز یعنی دین کے دارالخلافہ پر بھرپور حملہ کیا ہے۔ ان سے پہلے کے منکرین کا ایک آدھ تیر اگرچہ مرکز کی جانب بھی پرواز کر آیا کرتا تھا۔ مگر ان کے حملہ کا رخ اور ان کی یلغار کی قوت مرکز کے ادھر ادھر صرف ہو رہی تھی — منکرین انکارِ حدیث پر بحث کرتے وقت حدیث کے وجود پر بحث کرتے تھے۔ ان کے نزدیک موجودہ مجموعے (بخاری، مسلم وغیرہ) اس لیے قابلِ پسند نہیں تھے کہ وہ انہیں رسولِ کریمؐ کے قول و فعل کا ریکارڈ ہی نہیں مانتے تھے۔ اور ان منکرین کو بار بار یہ اعلان کرتے سنا گیا تھا۔ کہ اگر کسی قول کو حضور کا قول ثابت کر دیا جائے۔ تو اس کا نہ ماننا رسالت کا نہ ماننا ہو گا۔ گذشتہ اقتباسات اور حوالہ جات سے ان کا یہ نظریہ عیاں ہو رہا ہے۔

سب سے پہلے اہتمام کے ساتھ حافظ صاحب اسلم جیراج پوری نے اسوۂ حسنہ کے قلعہ پر حملہ کیا ہے۔ اگرچہ وہ دوسرے منکرین کی طرح ادھر ادھر بھی تیر برساتے رہے۔ مگر ان کا رخ اور تیور اسی جانب مرکوز رہا۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے "تعلیمات قرآن" نامی کتاب لکھ کر اپنے معارف سے دنیائے اسلام

کو یوں روشناس فرمایا :-

۱- اصولی کتاب قانون صرف اللہ کی کتاب ہے۔ (گویا ہم پر نازل ہو رہی ہے۔)

۲- رسولؐ کا فریضہ صرف پیغام الٰہی پہنچانا ہے۔ اور بس (یعنی پیغام پر عمل کر کے دکھانا اس میں شامل نہیں ہے!)

۳- اطاعت بحیثیت رسول اور اطاعت بحیثیت امیر، میں دو باتوں کا فرق ہے۔

۱- بحیثیت رسالت رسول اللہ کو کسی سے مشورہ لینے کا حکم نہیں تھا۔ اور امیر کی حیثیت سے لوگوں سے مشورہ لینے کا حکم دیا گیا تھا۔ گویا بحیثیت رسول آپ کی اطاعت قیامت تک فرض ہے۔ کیونکہ قرآن ہمیشہ کے لیے ہے۔ لیکن بحیثیت امیر آپ کی اطاعت بالمشافہ تھی۔ امارت کے فرائض ہمیشہ ہنگامی ہوں گے۔ کیونکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ماحول بھی بدلتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آج جو امیر ہوگا۔ وہ غزوہ بدر و احد کی مطابقت میں صرف نیزہ و شمشیر سے جہاد میں کام نہ لے گا۔ بلکہ موجودہ زمانے کے اسلحہ استعمال کرے گا۔ امراء کے مقابلہ میں منازعت کا حق حاصل ہے۔

۲- اللہ اور رسول کے الفاظ قرآن میں اکثر جہاں جہاں ساتھ آئے ہیں۔ ان سے مراد امارت ہے۔ جس کا قانون کتاب اللہ ہے۔ اور جن کے نافذ کرنے والے رسول اللہ یا ان کے جانشین ہیں۔..... آخری اختیار اللہ اور رسولؐ یعنی امارت ہے۔ اس لیے رسول اللہ کا جو منصب بحیثیت امیر کے ہے

وہی ان کے خلفاء کا بھی ہوگا۔

۳۔ ہمارے رسول نے جملہ احکام قرآنی مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ پر عمل کرکے دکھلا دیا۔ اور مسلمان اسی پر عمل کرنے لگے۔ یہ اسوۂ حسنہ امت کے پاس عمل متواتر کی شکل میں موجود ہے۔ جس کے مطابق رسول اللہ کے عہد[1] سے نسلاً بعد نسل وہ عمل کرتی چلی آتی ہے۔ اسی لیے یہ یقینی اور دینی ہے۔ اس کی مخالفت خود قرآن کی مخالفت ہے۔"

(اسلم صاحب کے غلط دعاوی کے جواب میں مختلف گوشوں سے بہت کچھ تردیدی لٹریچر شائع ہوچکا ہے۔ "ترجمان القرآن" صفحہ ۳۱ میں ایک مضمون اسلم صاحب کی تردید میں موجود ہے۔ جس کے مطالعہ سے ان کی غلط روش کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے۔)

اسلم صاحب نے رسولؐ کے ارشادات (قول و فعل) کے دو حصوں میں تقسیم کرکے (مذہبی اور سیاسی یا دینی اور عمومی) بحث کا رخ یکسر بدل دیا۔ اس کے بعد اہتمام کے ساتھ نفس رسالت، وحی خفی و جلی، رسول کی دو حیثیتیں۔ محمد ابن عبداللہ و محمد رسول اللہ کے سے موضوعات منکرین کے ہاں عام ہونے لگتے ہیں۔ اور یہی وہ مقام ہے۔ جہاں سے بے دینی اور سرکشی کا چشمہ پھوٹتا ہے۔ اور ایک بار جب پھوٹ بہے۔ تو اسے روکا نہیں جاسکتا۔ ناظرین آگے چل کر دیکھیں گے کہ پرویز صاحب کی جملہ بحثوں کا محور انہی سطور پر رہتا ہے۔

---

[1] ہمارے نزدیک یہ درست ہے۔ مگر آپ منکر حدیث ہوکر کیسے ثابت کرسکتے ہیں کہ یہ تواتر حضور کے وقت سے آرہا ہے۔ اس کا ثبوت کہاں ہے؟

اگرچہ اسلم صاحب کے اس مضمون کے شائع ہونے پر انہوں نے "مدیر ترجمان القرآن" کے نام اپنے خط[1] میں اسلم صاحب سے اختلاف کا بھی اقرار کیا تھا۔ مگر اب ترقی کرتے کرتے استاد شاگرد دونوں دو قالب و یک جان ہیں۔ بلکہ پرویز صاحب نے اسلم صاحب کے اس خاکے میں ایسا رنگ بھرا ہے کہ شاگرد کی چابک دستی اور اجر قربی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ "تعلیماتِ قرآن" پر تنقید پڑھ کر پرویز صاحب لکھتے ہیں:۔

"آخیر میں اتنا گذارش کرنا ضروری ہے کہ چونکہ میں نے اس میں آپ کو مخاطب کیا ہے۔ اس لیے وہی امور پیش کیے ہیں۔ جن میں مجھے آپ کے جواب کے بعد مزید اطمینان کی ضرورت نظر آئی۔ رہے وہ امور جن سے اتفاق ہے۔ یا صاحب "تعلیمات" سے جن امور میں اختلاف ہے۔ انہیں دہرانا تحصیل حاصل سمجھا گیا ہے۔ اور یہ گزارشات بھی محض لیطمئن قلبی ہیں"

---

[1] اگر کوئی صاحب منکرین حدیث کی طرح متانت سے ہاتھ دھونے پر آمادہ ہو تو وہ اسلم و پرویز کے کارناموں پر بحث کرتے ہوئے برق صاحب کی اقتدا میں دو ابلیس کے عنوان سے بہت کچھ لکھ سکتا ہے۔ اور اعتراض وارد ہونے پر بآسانی لفظ "ابلیس" کی تشریح مختلف کتب لغات کی مدد سے ایسی کر سکتا ہے کہ اس پر کسی اخلاقی ضابطہ کی رو سے بھی حرف گیری ممکن نہ رہے۔ جیسا کہ پرویز صاحب۔ لفظ زکوٰۃ، صلوٰۃ وغیرہ کی جدید تشریح کر کے ان الفاظ کے اصطلاحی معانی پر ضرب لگانے کے درپے ہیں۔

اسی سادگی اور اتفاق کو دیکھتے ہوئے ان کی توضیح پر ترجمان القرآن کے مدیر کو یہ لکھنا پڑا کہ "میں سمجھتا ہوں کہ چودھری صاحب اسی گروہ (تیسرا گروہ جو حیثیت رسالت اور حیثیت شخصی میں فرق کرتے وقت تھوڑی سی غلطی کرتا ہے) سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور میں ابتدا ہی میں یہ امر واضح کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ ان کا مسلک مقدم الذکر دونوں گروہوں کی بہ نسبت حق سے بہت زیادہ قریب ہے" صـ۲۳

تھوڑے عرصہ بعد چودھری غلام احمد صاحب پرویز نے تیسرے گروہ سے بڑھ کر پہلے گروہ کی قیادت سنبھال لی۔ اور جو کچھ آج کر رہے ہیں۔۔ ان کی اساس اسلم صاحب ہی کی رکھی ہوئی ہے۔

اسلم صاحب نے اپنی بات کو زیادہ کھل کر علم حدیث میں یوں بیان کیا ہے:۔

"قرآن میں جہاں جہاں اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے مراد امام وقت یعنی مرکز ملّت کی اطاعت ہے۔ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُمت میں موجود تھے۔ ان کی اطاعت اللہ کی اطاعت تھی۔ اور آپ کے بعد آپ کے زندہ جانشینوں کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہو گی۔۔۔۔۔۔۔۔ الغرض قرآن امام وقت ہی کے ساتھ اُمت کی نجات اور کامیابی کا ذریعہ ہے۔۔"

علم حدیث صـ۳۴ - ۳۶

اس طرح وہ موجود الوقت حاکموں کی حاکمیت کے لیے میدان ہموار کرنے میں سرگرم کار رہے۔ اور انہوں نے حاکم وقت کی اطاعت عین خدا اور رسول صلعم کی اطاعت قرار دے کر امت کے لیے ظالم اور بدکردار حاکم کے حکم سے باہر ہونے

کی راہیں مسدود کر دینی چاہئیں ـــــ اور تحریفِ قرآن کے راستے کی جملہ رکاوٹیں دور کرنے کی جدوجہد کی ۔

مولانا اسلم کا مضمون "منکرینِ حدیث" مشمولہ کتاب مطالعہ حدیث ص ۲۵۰ ـ ۲۶۶) ان کے اور ان کے متبعین کے خیالات کا ملحص کہلانے کے قابل ہے ۔ اس میں انہوں نے انکارِ حدیث کی جو وجوہات بیان کی ہیں ۔ اور تدوینِ حدیث پر جو شکوک پیدا کیے ہیں ۔ طلوعِ اسلام کے مدیر اور ان کے ہم نوا (جدید منکرین) ان ہی کا اعادہ کرتے رہتے ہیں ۔ ان تشکیکات کا جواب مصدقین حدیث کی جانب سے کئی کتابوں اور مقالوں میں دیا گیا ہے ۔ ہم ان اوراق میں محولہ بالا مضمون کی چند فریب پرور اور جعل آفسترین باتوں پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ ہم منکرین کی فہرست میں اسلم صاحب کو پڑھا لکھا اور صائب الرائے قسم کا آدمی سمجھتے تھے ۔ مگر اس مضمون کے مطالعہ پر ہماری رائے تبدیل ہو گئی ہے ۔ اور ہم بلا خوف تردید یہ کہہ رہے ہیں ۔ کہ اسلم صاحب بھی دوسرے یارانِ طریقت کی طرح فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں ۔ چند حوالے ملاحظہ ہوں ۔

۱ ـ فبای حدیث بعدہ یؤمنون ۵۰/۷۷

اس قرآن کے بعد وہ کس حدیث پہ ایمان لائیں گے ۔

۲ ـ فبای حدیث بعد اللہ وآیاتہ یؤمنون ۶/۴۵

اللہ اور اس کی آیتوں کے بعد وہ کس حدیث پہ ایمان لائیں گے ۔

ناظرین ! آپ کسی مترجم کا ترجمہ قرآن سامنے رکھ کر ان آیات کا سیاق و سباق دیکھیں گے تو اس سے یہ مطلب مبرہن ہو جائے گا ۔ کہ ان آیات میں حدیث

سے مراد بات اور دلیل ہے ۔ رسولؐ کا وہ قول و فعل مراد نہیں جس پہ حدیث کا لفظ اصطلاح کے طور پہ بولا جاتا ہے ۔ لغت اور اصطلاح کا جو فرق ہے ۔ وہ اہلِ علم پہ پوشیدہ نہیں ہے ۔ ایک لفظ جس مقام پہ وضعی معنی دے رہا ہو ۔ اگر وہاں اصطلاحی معنی مراد لیے جائیں ۔ اور جہاں اصطلاحی معنی مقصود ہوں وہاں لفظ کو وضعی معنی پہ محمول کیا جائے تو اس طرح کسی زبان کا جو ستیاناس ہو گا وہ واضح اور روشن ہے ۔ ادبیات کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی اس فرق سے واقف ہے ۔ لیکن منکرینِ حدیث اس فرق کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے ۔ جناب پرویز صاحب نے جو جدید لغات القرآن وضع فرمائی ہے ۔ اس میں یہی طریقِ کار اختیار کیا گیا ہے کہ جو الفاظ قرآنی اصطلاح کے طور پر مستعمل ہیں ۔ ان کو لغت کے حوالے کر کے صحیح مفہوم کا تیا پانچہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

"۳ ۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ وَّيَتَّخِذَهَا هُزُوًا ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ ۳۱/۶

بعض آدمی وہ ہیں جو حدیث کے مشغلہ کے خریدار ہوتے ہیں ۔ تاکہ لوگوں کو اللہ کی رہ سے بھٹکا دیں ۔ بلا علم (یقین) کے ۔ اور اس کو مذاق بنا لیں ۔ یہ لوگ ہیں جن کے لیے خوار کرنے والا عذاب ہے ۔" صـ ۲۵۳

اس آیت کا ترجمہ کرتے وقت بھی اسلم صاحب نے فریب سے کام لیا ہے اسلام کے کسی دور میں کسی ایک عالم کے ترجمہ کی رو سے اس ترجمہ کو صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ لَهْوَ الْحَدِيْثِ سے مراد گانا اور فضولیات کا شغل اختیار

کرتا ہے۔ اور اسلم صاحب کو اس کا علم ہے۔

لکھتے ہیں :۔

" اس آیت میں لہو الحدیث کی تفسیر ائمہ حدیث نے غناء کی ہے۔ یعنی گانا اور اس کی روایت ابن عباس تک پہنچائی ہے۔" ص ۲۵۳۔

یہاں ائمہ حدیث کہہ کر یہ تاثر دیا ہے کہ دوسرے مترجمین نے یہ ترجمہ نہیں کیا۔ حالانکہ کسی ترجمہ نے اس سے "حدیث" مراد نہیں لی ـــ یہ فریب دہی نہیں تو اور کیا ہے۔!

م ـ " حدیثیں بجز متواتر کے جن کے وجود ہی میں بحث ہے۔ (تین چار سے زیادہ نہیں) باتفاق ائمہ حدیث ظنی ہیں۔

امام غزالی لکھتے ہیں :۔

خبرِ واحد یقین کا فائدہ نہیں دیتی خبر واحد کی تعریف بھی اسی میں ہے۔ ہم اس مقام پر خبرِ واحد سے وہ خبر مراد لیتے ہیں۔ جو متواتر تک جو مفید یقین ہے۔ نہ پہنچے۔ مثلاً جس خبر کو ایک جماعت ۵ - ۶ آدمیوں سے روایت کرے۔ وہ خبر واحد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ظن کا روادار نہیں ہے" ص ۲۵۷

اس کے بعد اسلم صاحب نے قرآن کی تین آیات اس مضمون کی درج کی ہیں۔ جن میں ظن کے اتباع سے رد کا گیا ہے۔ اور یوں یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کہ حدیث ظن ہی ظن ہے۔ اگر یہ لاعلمی کی وجہ سے ہوتا تو ہم انہیں فریب کار نہ گردانتے۔ مگر یہ جان بوجھ کر کیا جا رہا ہے۔ اردو زبان میں لفظِ ظن کا جو عام مفہوم ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر اسلم صاحب نے یہ جال پھیلایا ہے۔ خبر واحد سے متعلق وہ اسی کتاب کی ابتدا میں ظنی ہونے کا اظہار اس شدت سے کرتے رہیں

کہ۔ گویا ظن باطل کے مترادف ہے

۵ "یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں جو جو فرقے پیدا ہوئے۔ ان کی بنیادیں خاص خاص روایتوں ہی پر تھیں اور اب تک ہیں" [۱]

کہا جاتا ہے کہ فہم قرآن میں اختلاف ممکن ہیں۔ اس لیے پھر بھی فرقے پیدا ہو سکتے ہیں۔ بے شک فہم معانی میں اختلاف ہوں گے۔ لیکن ان کے اوپر فرقہ کی تعمیر نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ قرآن کی حقیقت ایک — تعلیم ایک — مفہوم ایک — اور غرض اور منتہائے نظر ایک ہے۔ جو شخص کسی مسئلہ میں کوئی رائے قائم کرے گا۔ علماء قرآن کے مسلسل غور و فکر کے بعد، اگر وہ صحیح ثابت ہو گی — تو تسلیم کر لی جائے گی۔ ورنہ مسترد" [۲]

جب مفہوم میں اختلاف کے امکان کو تسلیم کرتے ہو تو پھر حقیقت ایک — تعلیم ایک — مفہوم ایک — غرض اور منتہائے ایک..... کی رٹ کیا معنی رکھتی ہے۔! — فرقہ کی تعمیر نہ ہو سکے گی — ! — یہ مستقبل کا دعوےٰ "طلوع اسلام" کے مدیر کے اس دعوے کا نغمہ نوبہار ہے۔ کہ جب نظام ربوبیت قائم

---

[۱] ص ۲۶۵ [۲] ص ۲۶۶

ہو جائے گا۔ تو کوئی غریب ہی نہیں رہے گا۔
اور زکوٰۃ وغیرہ کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔
فہم قرآنی میں اختلاف کے وقوع کو اسلم صاحب نے
اس لیے تسلیم کر لیا ہے کہ ان کے اولین اماموں نے
جب قرآن کو جدید لباس پہنانا شروع کیا تھا۔ تو چند
ہفتوں کے اندر اندر ان میں کئی فرقے بن گئے تھے۔ یہ بات
جس کتاب میں اسلم صاحب درج فرما رہے ہیں۔ اس
کا مصنف سید مقبول احمد تین نمازوں کا (کبھی دو کا) اور چند
روزوں کا قائل ہے۔ اور اسلم صاحب خود دیباچے میں ان
سے ان سے اتفاق نہیں کر سکتے۔ اور پانچ نمازوں اور
تیس روزوں (ماہ رمضان) کے قائل ہیں۔ اب ان دونوں
حضرات کے مریدین ان کی پیروی میں استقامت
کا اظہار کریں۔ تو ان کے دو گروہوں کو دو فرقے نہ
کہنا کس منطق کی رُو سے درست ہو گا۔ اور اگر اسلم
صاحب جیسے قرآن شناسوں کا کوئی بورڈ اختلاف مفہوم
کی ممانعت زبانی زبانی اپنے استدلال کے زور سے
کرے گا۔ تو اختلاف کی بندش کیسے وقوع پذیر ہو
جائے گی۔ ممکن ہے کہ اسلم صاحب کے اس
اشارے میں یہ مفہوم ہو کہ پرویزی علمائے قرآن بذریعہ شمشیر اپنی

دائے منوانے کے مجاز ہوں گے۔

انہوں نے اتفاق کی دلیل یہ بھی دی ہے۔ کہ "جس طرح اس عالم مادی میں علماء طبیعی وغیرہ الگ الگ نظریے قائم کرتے ہیں۔ پھر ایک مدت تک غور و فکر کرتے کرتے ان پر اس کی صحت یا غلطی نمایاں ہو جاتی ہے۔" اسی طرح علماء قرآن بھی غلطیوں کو دور کریں گے۔

دلیل بظاہر وزنی ہے۔ مگر حقیقتاً بودی اور فریب پر مبنی ہے۔ علماء طبیعی کے اختلافات میں مسائل نظری کے اختلافات کی نوع اور قبیل کے نہیں ہوتے۔ ان کے نظری اختلافات کو مادی تجربات اور مشاہدہ غلط یا صحیح ثابت کر دیتا ہے۔ مگر قرآن کے فہم میں جو اختلاف ہو سکتا ہے۔ وہ مادی تجربہ کر کے غلط یا صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ منکرین حدیث کے ایک رکن عظیم "ایٹم بم" کے خالق جناب برق صاحب

نے "دو اسلام" میں لکھا ہے۔

"آیہ وضو میں صرف ایک اختلاف کی بنا پر کہ کسی نے أَرْجُلَكُمْ کو أَرْجُلِكُمْ پڑھ دیا۔ پورا ایک فرقہ پیدا ہو گیا۔ جو وضو میں پاؤں پر مسح کرتا ہے۔ اگر قرآن میں اس قسم کے اختلافات کی اجازت دے دی جائے۔ تو ہر مسلمان کا مذہب دوسرے سے جدا ہو جائے" [۱]

اسلم صاحب کے ارشاد کی رُو سے مسح کرنے اور وضو کرنے کے تجربے کو لاکھ سال تک بھی جاری رکھا جائے تب بھی اس تجربہ کی رو سے فہم کے اختلاف کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ جسے اختلاف دور کرنا منظور ہو گا وہ اس لفظ کے صحیح مفہوم کے لیے اسوہ حسنہ کے دربار میں حاضر ہو کر اپنا اطمینان کر لے

---

[۱] ص ۳۳۶

گا - علماء قرآن اپنی سمجھ کی رو سے . صرف قرآن کی رو سے اس کی طمانیت کے سامان پیدا نہیں کر سکیں گے ۔

منکرین کا اندازِ تنقید

غلام جیلانی صاحب برق نے "دو اسلام" لکھ کر اپنے خیال میں دنیائے اسلام پر احسان کیا ہے۔ انہوں نے اپنی اس تصنیف میں حدیثِ اسلام پر ایک نظر ڈالی ہے۔

لکھتے ہیں :-

"میں نے سوچا کہ حدیث و قرآن کی بتائی راہوں میں اتنا فرق کیوں ہے۔ اور راہیں بھی ایسی کہ کسی مقام پر وہ آپس میں نہیں ملتیں۔ احادیث کی تدریخ پڑھی تو مجھ پر منکشف ہوا کہ کہیں تو اعدائے اسلام نے توہینِ اسلام کے لیے۔ اور کہیں ہمارے علماء نے قرآن کے تیغ و سنان والے اسلام سے بچنے کی خاطر تقریباً چودہ لاکھ احادیث وضع کر رکھی ہیں۔ جہاں ایک ایک دعا کا صلہ لاکھ لاکھ جنت قرار دیا تھا۔ اس انکشاف کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ مسلمان ہر جگہ محض اس لیے ذلیل ہو رہا ہے کہ اس نے قرآن کے عمل، محنت اور ہیبت والے اسلام کو ترک کر رکھا ہے وہ اوراد وادعیہ کے نشے میں سرمست ہے۔ اور اس کی زندگی کا تمام سرمایہ چند دعائیں اور چند تعویذ ہیں۔ بس اور ساتھ ہی یقین ہو گیا کہ اسلام دو ہیں۔ ایک قرآن کا اسلام جس کی طرف اللہ بلا رہا ہے۔ اور دوسرا وضعی احادیث کا اسلام جس کی تبلیغ پہ ہمارے اسی لاکھ ملاّ اور پیچھڑوں کا سارا زور صرف کر رہے ہیں۔" ؎

؎ دو اسلام صفحہ ۲۰-۲۱

حدیث کے خلاف لکھنے والوں کا ابتدا ہی سے یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ قرآن کو ماخذ قانون ماننے کا شد و مد کے ساتھ اقرار کرتے ہیں۔ ہر حکم کی تفصیل کے مندرج قرآن ہونے پر زور دیتے ہیں۔ اور قرآن کے ساتھ کسی دوسرے علمی ذریعے کی شمولیت کو ناروا، نامناسب اور غیر اسلامی قرار دیتے ہیں۔ ان بزرگواروں میں سے اکثر جان بوجھ کر اسلام کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔ اور جو اپنی سمجھ کے مطابق خلوص کے کام لے کر احادیث پر تنقید فرماتیں ان کا اندازِ بیان اور زاویۂ نظر تنقید اور تنقیص کرتے وقت دوسروں سے رکھتا ہے۔ انصاف پسندی کا یہ اقتضا ہے کہ ان حضرات کے تنقیدی سرمایہ کو غور سے دیکھا جائے۔ ان کے ارشادات پر ٹھنڈے دل سے نظر ڈالی جائے۔ ان کے سوالات کا تسلی بخش جواب دیا جائے۔ وہ اس طرح مطمئن نہ ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ممکن ہے دوسرے سمجھدار اور منصف مزاج قارئین کو فائدہ پہنچے اور وہ ان منکرین کی زہر چکانی سے محفوظ ہو جائیں۔

ہم ان کے ہمنوا نہیں ہیں۔ جو معترضین کا جواب کفر کے فتووں سے دیتے ہیں۔ کافر سازی کے ان تیروں کو اب ترکش میں ہی رکھنا بہتر ہے۔ ان کے اسراف نے ان کی قدر و قیمت کھو دی ہے۔ جس کے خلاف کفر کا فتویٰ لگتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عوام اور تعلیمیافتہ طبقہ دونوں ان "کافروں" کی جانب پہلے سے زیادہ جھکتے ہیں۔ اور انہیں ان فتووں سے نقصان کے بجائے فائدہ ہوتا ہے۔ ان کی تشہیر کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے۔ اور اس شہرت کے بعد ان کے "فرمودات عالیہ" کے مطالعہ کا شوق پروان چڑھنے لگتا ہے ـــــ کفر کے فتاویٰ کی افادیت سے انکار نہیں۔ مگر ان کے جا و بے جا استعمال نے اس طریقِ کار کو آج اتنا مخدوش کر دیا ہے۔ کہ جب کسی کے خلاف

کفر کا فتویٰ سننے میں آتا ہے۔ تو پہلا تاثر یہی پیدا ہوتا ہے۔ کہ وہ "کافر" مظلوم ہوگا — لہذا ——— جن حضرات کے دلوں میں اسلام کا درد ہے۔ اور جو اس درد کا اظہار مناسب اور سود مند طریقے سے کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں چاہئے کہ وہ جس لٹریچر کو کفر پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ اس کی خامیاں اتنی ہوشیاری اور انصاف کے ساتھ پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے پیش کر دیں کہ کفر پسند لٹریچر سے پورے ملک میں نفرت پیدا ہو جائے اور دین کے ان دشمنوں سے دانشمند اور باانصاف مسلمان بیزار ہو جائیں۔

منکرین حدیث کا ایک گروہ عرصے سے مجوِ کار ہے۔ ان کے اعتراضات میں اتنی جان نہیں ہے۔ جتنی ان کے حواریوں کے ہاں مشہور ہے۔ اور ان کا مقابلہ کرنا اتنا دشوار نہیں ہے۔ جتنا کہ محسوس کیا جا رہا ہے۔ ان کے وسائل نشر و اشاعت کے میدان واقعی قابلِ داد اور موثر ہیں۔ ان کے ہاں اشاعتی کاموں کے لیے سرمایہ کی فراوانی حیران کن بھی ہے اور حوصلہ شکن بھی ——— مگر سر و سامان کی اس ہمہ گیری سے خوف کھا کر مقابلے میں نہ آنا ——— دانشمندی کے بھی خلاف ہے۔ اور حقیقت کے مستور رہنے کے خدشے کی رو سے بھی، اسلام کے لیے نقصان دہ اور انسانیت کے مستقبل کے لیے مہلک ہے۔

ہم نے پچھلے صفحات میں انصاف پسندی کا نام لیا ہے۔ اس سے ہمارا مفہوم یہ نہیں ہے۔ کہ ہم صرف لفظی طور پر اس کے ورد کو پسند کرتے ہیں۔ اور عملی طور پر اس سے دور رہنے ہی میں مصلحت دیکھتے ہیں۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم منکرین حدیث کے لٹریچر پر تنقید کرتے وقت دلائل و براہین سے کام لیں گے —

دل آزار کلمات سے دور رہیں گے۔ ان کی نگارشات کے حوالے مسخ کر کے نہیں دیں گے ۔ ان کی اس طرزِ فکر کا صحیح سراغ لگائیں گے ۔ اور ان محرکات تک پہنچنے کی پوری پوری کوشش کریں گے ۔ جن کے زیر اثر یہ بزرگوار امت سے کٹ کر اپنے لیے ایک نئی راہ تراشنے میں مصروف ہیں ۔

ہمیں یہ امید ہے کہ اگر ہم اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو اس کے دور رس نتائج کا اندازہ اگرچہ سردست نہیں ہو سکتا تاہم بہت جلد اس ملک میں انصاف اور اعتدال کے ساتھ کسی مسئلے پر سوچنے کی کم از کم ایک مثال تو قائم ہو جائے گی ۔

ہمارے علمائے کرام کو، اپنے علمی وقار کے احساس کو برقرار رکھتے ہوئے یہ سوچنا چاہیئے کہ دین کے اس حصے سے بیزاری کی اصلی وجوہات کیا ہیں ۔ ہمیں یہ تسلیم ہے کہ بعض لوگوں نے دنیاوی جاہ و منصب کے لیے حدیث کو نشانہ بنا رکھا ہے ۔ بعضوں نے کسی "مجبوبہ" کا اشارہ پا کر یہ تحریک شروع کر رکھی ہے ۔ بعضوں نے کم علمی اور اسلام کے سطحی مطالعہ کی بنا پر یہ روش پسند کر لی ہے ۔ لیکن اس فہرست میں چند اور وجوہ کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے ۔ مثلاً ایک عرصے سے حدیث کے علم کو محدود حلقوں تک محصور کر دیا گیا ہے ۔ اور ان درس گاہوں میں بھی طلبہ کو آخری سال میں حدیث پڑھائی جاتی ہے ۔ اور اس سے پہلے انہیں دوسرے درسی مشاغل میں مصروف رکھا جاتا ہے ۔ جن کی افادیت اب بحال نہیں ہے ۔ ہمارے دینی مدرسوں میں جو فلسفہ پڑھایا جاتا ہے ۔ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ وہ اب پرانا ہو گیا ہے ۔ منطق کی جو کتابیں رٹائی جاتی ہیں ۔ حقیقت

یہ ہے کہ دنیا والے ان کتابوں کو نظر انداز کر بیٹھے ہیں۔ اور قرآن کو جن تفاسیر کی مدد سے سمجھا جاتا ہے۔ ان کی افادیت اور فیض رسانی کا دائرہ مرور زمانہ سے تنگ ہو گیا ہے۔ اور آج کی دنیا والے قرآن کو سمجھنے کے مشتاق ہونے کے ساتھ ایسے انداز کے دلدادہ ہیں جو جدید ہو۔ اگر ہمارے دینی مدرسوں میں ان علمائے اسلام کی تفاسیر سے مدد لی جائے جو جدید دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ تو اس طرح دین کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اور معترضین کی زبانیں اتنی تیزی اور طراری نہیں دکھا سکیں گی۔ درس نظامی اپنے وقت کے لیے مفید ہی نہیں بلکہ نہایت عمدہ اور بہترین تھا۔ مگر آج اسے بحال رکھنا، اور نصاب میں تبدیلی روا نہ رکھنا اسلام کے ساتھ دشمنی کے مترادف ہو گیا ہے۔ قرآن کو سمجھانے کے ہر جدید علم سے مدد لینا قرآن اور اسلام کے خلاف نہیں ہے۔ جدید علوم اس وقت مذہب کے لیے نقصان دہ ہوا کرتے ہیں۔ جب مذہب پسند طبقہ ان علوم جدیدہ سے مرعوب ہو کر ان کو سند کے طور پر پیش کرتا ہو۔ اور دین کے علمی ذخیرے کو ان کی رو سے دیکھتا ہو اور جدید علوم پر ایمان لے آنے کے بعد مذہب کی جانب بڑھتا ہو۔ ظاہر ہے کہ جب علوم جدیدہ کی بالادستی تسلیم کر لی گئی ہو۔ تو اس کے بعد ایک عالم، دین کا مطالعہ کر کے جو فیصلہ دے گا وہ لازماً علوم جدیدہ کے حق میں ہو گا۔ اور مذہب کے مخالف ——— اس کے برعکس جو لوگ دین کو تھام کر۔ اللہ اور اس کے دین کی عظمت جان کر علوم جدیدہ کی جانب بڑھتے ہیں۔ انہیں ان کے اندر اپنے ایمان اور اطمینان کے شواہد ملتے ہیں۔ اور مذہب کی بالادستی قائم رکھ کر ان کے فیصلے دین اور دنیا دونوں کے لیے سود مند ہوتے ہیں۔

ہماری ان معروضات کے ثبوت کے لیے عہد عباسیہ کی علمی تاریخ اور ہندوستان میں سر سید اور ان کے رفقاء کی روش کو پیشِ نظر رکھنا کافی ہے — نئے ذہنوں کو نئے رنگ کی ضرورت ہے۔ جب ہم نے زندگی کے دوسرے میدانوں میں جدت پسندی کا عام ثبوت دے رکھا ہے۔ تو ہمیں مذہب کے میدان میں بھی جدید افکار کو در آنے کی عام اجازت دینی ہوگی۔ اس کے بغیر مذہب کے خالص اور سچے ہونے کا ثبوت نہیں دیا جا سکتا کہ آج کی دنیا کے ہر چیلنج پر لبیک کہا جا سکے۔ اور قرآن و سنت کے ہتھیاروں سے کفر و بدعت کے حملوں کو روکا جائے۔ یہ کام کسی ایک طبقے تک ہی محدود نہیں ہونا چاہیے۔ جس کسی سے، جس وقت اور جہاں کہیں، جو کچھ ہو سکے اسے کرنا چاہیے۔ دین پسندی اور خدا پرستی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم قدم قدم پر اسی جدوجہد میں مصروف ہو جائیں۔

منکرینِ حدیث کے پاس جو ہتھیار ہیں ان کی تفصیل گزشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہے) ان کے مطالعہ کے بعد اگر کوئی سادہ مزاج مسلمان یہ کہے کہ ان سے اسلام کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اسلام تو بڑا پختہ اور مضبوط دین ہے۔ ان کچی گولیوں سے اس کا کچھ نہیں بگاڑا جا سکتا —— تو ہم اس سادگی کے اظہار پر خاموش ہو جانے ہی پر اکتفا کریں گے۔ اور اگر کوئی متزلزل مزاج مسلمان ان سطور کے مطالعہ پر سراسیمگی اور حواس باختگی کا شکار ہو جائے تو ہم اسے یہ تسلی دیتے ہیں کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ منکرینِ حدیث کے مورچہ سے جو گولہ آتا ہے۔ اسے آنے دیجئے۔ حصارِ نبوت کے در و دیوار میں ابھی ہر گولہ کو برداشت کر لینے کی تاب و تواں موجود ہے۔ بیرونی دیواروں اور احاطے کے چند نقش و نگار اس یلغار سے معرضِ خطر

میں ہیں۔ مگر جب سنت کے اس عظیم الشان قلعہ سے مخالفین پر گولہ باری کی جائے گی تو وہ پسپا ہونے ہی میں مصلحت پائیں گے۔

ہمیں اس بات کا نہایت افسوس ہے کہ بعض منکرین حدیث نے جدید تعلیم یافتہ حضرات کی حدیث سے بے پروائی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی قدم قدم پر کوشش کی ہے ۔ انہوں نے اپنے اعتراضات میں بکثرت ان احادیث کے حوالے دئے ہیں۔ جو موضوعات میں شامل ہیں۔ اور جن کے وضع ہونے پر ہر زمانے کے مسلمان علماء اتفاق کرتے آئے ہیں۔ ان موضوع احادیث کو بحث کے دوران میں صحیح احادیث کی صورت میں پیش کرنا قلب و نظر کی ناصافی کا ثبوت دینا ہے۔ منکرین حدیث کا باطن اگر صاف ہے اور ان کا مقصد امت کو صحیح منہاج پر چلانا ہے۔ تو اس کے لیے جھوٹ کو سچ کر کے پیش کرنا سخت ناانصافی، دروغ پروری، اور منافقت ہے۔ اس طرح ان لوگوں سے حسب دل خواہ دادِ سخن لی جا سکتی ہے۔ جو موضوع اور صحیح کے فرق سے ناآشنا ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو منکرین حدیث کے اس طریق استدلال کا علم ہو جاتا ہے۔ ان کی نظروں میں منکرین کا کیا وقار ہو سکتا ہے۔

اس سے زیادہ افسوس ناک روش ان نقادوں کی یہ ہے کہ وہ اپنی نگارشات میں حضرت رسالت مآب کی ذات گرامی اور حضور کے صحابہ کرامؓ سے متعلق بات کرتے وقت توہین آمیز لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ اور ان کے قلم سے حضور کا مبارک نام ایسی خشکی سے لکھنے میں آتا ہے کہ ذوق سلیم کو ناگوار گزرتا ہے۔ آخر یہ سب کیوں ہے ؟ ـــ کیا دین کے پرستار اور اسلام کے شیدائیوں کا یہی طریقہ رہ گیا ہے ـــ کیا مادی بننے کے لیے اس کے سوا کوئی اور تدبیر نہیں ہے۔ ؟

کیا دنیا میں ایسے لوگ موجود نہیں ہیں جو اس طرزِ تحریر اور اندازِ بیان کو ناپسند کرتے ہوں۔ انسانیت کے محسنِ اعظم، صداقت اور ایمان کے آفتاب لازوال، علم و عمل کے شہنشاہ پر جلال کی عزت نہ کرنا، باطن کی تاریکی، ظاہر کی گمراہی، ازلی بدبختی، اور ابدی روسیاہی ہے اور منکرین حدیث کا دوسرا حربہ ہر عالم کو ملاّ کہہ کر بدنام کرنا ہے۔

ع ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

دین کے خادموں کو ملاّ کے خطاب سے، نوازنے کی بھڑاس تو نکالی جا سکتی ہے۔ مگر صحیح راستے پر چلنے والے دین کے ان خادموں کی خدمت کو حرفِ غلط کی طرح مٹایا نہیں جا سکتا۔ یہ ناممکن ہے، ایسا خیال ابلہ فریبی ہے، کوتاہ اندیشی ہے، ہمارا یہ مسلک قطعاً نہیں ہے۔ کہ ہم ہر ملائے مکتبی کو دین کا خادم سمجھتے ہیں۔ اور جن لوگوں کے اندیشہ نظر کے فساد نے اسلام کو نقصان پہنچایا ہے۔ انہیں اسلام کا محسن سمجھتے ہیں۔ بلکہ ہمارے نزدیک اسلام کا ہر دشمن قابلِ نفرت ہے وہ بدقسمتی سے کسی مسجد کے اندر ہو۔ یا کسی خانقاہ کو، "فیض یاب" کر رہا ہو۔ کسی مدرسہ میں ہو یا کسی کالج میں، کسی بنگلے میں ہو یا کسی اسمبلی میں، کسی بازار میں ہو یا کسی کارخانے میں ——— لیکن جب منکرین حدیث ہر عالم کو، ہر امام کو، ہر قاضی کو، ہر فقیہ کو، ہر شیخ کو، بلا تخصیص و تمیز ——— ملاّ قرار دیتے ہیں۔ اور ہر زمانے کے بزرگوں کو اسلام کا دشمن گردانتے ہیں۔ تو اس وقت انصاف پسندی کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ منکرین کی اس روش کو اسلام کے لیے نقصان دہ سمجھا جائے۔

جن بزرگواروں کو، اہلِ اسلام آج تک، صحابی، تابعی، مجتہد، امام، فقیہ، محدث،

شیخ طریقت، مولانا، علامہ، کہتے آئے ہیں۔ اور جن کے نقشِ قدم پر چلنا ہر دور کے مسلمانوں کے لیے باعث صد افتخار رہا ہے۔ اور جن کی مساعی جمیلہ کی بدولت اسلام نے ترقی کی ہے۔ اور جن کی محنتوں اور کاوشوں کے دم سے آج علوم اسلامیہ کا وجود ہے ـــــ انہیں منکرینِ حدیث، ملّا کے نام سے پکارتے ہیں اور اسلام کا دشمن گردانتے ہیں۔

ع   ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا

اقبالؒ اور منکرین حدیث

مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اسلام میں قانون سازی کے بنیادی
قرآن اور سنت ہیں۔ جدید دور میں ایک گروہ سنت کے معلوم کر
کے مستند ذرائع (احادیث) کو نیست و نابود کرنے کے درپے
اس گروہ کے قائد اپنے آپ کو علامہ اقبالؒ مرحوم کا مرید اور پیرو بتا۔
ہیں۔ اور علامہ مرحوم کے افکار کو مسخ کر کے پیش کرتے ہیں۔

اس کتاب میں علامہ کے صحیح افکار کو تشریح و توضیح کے سا
پیش کیا گیا ہے۔ نیز منکرین حدیث کے اولین اماموں کے افکار پر بھی
تبصرہ کیا گیا ہے۔

مصنفہ پروفیسر محمد فرمان ایم۔اے

صفحات ۲۴۰ سائز = ۲۰ × ۳۰ / ۱۶

قیمت عمدہ ایڈیشن تین روپیہ

عام ڈھائی روپیہ

مکتبہ مجددیہ۔ نور پور شرقی گجرات (پاکستان)